ڈاکٹر فرمان فتح پوری

---بطور غالب شناس---

سیّدہ افصح وحید

ابلاغ پبلشرز، مین مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

انتساب

''ماں جی'' اور ''ابا جی''

کے نام

ـــہ

سلگتی دھوپ گھنی چاندنی سی ہوتی ہے

تمہارے ساتھ یہ دنیا نئی سی ہوتی ہے

سیّدہ افصح وحید

—— ۲۰۰۲ء ——

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، بطور غالب شناس

مقالہ برائے ایم اے (اردو)

سیّدہ افصح وحید

ناشر: محمد جمیل النبی خاں

سرورق: کامران ہاشمی

کمپوزنگ آرٹ رياض محمود انجم (گولڈن گریڈ) لاہور

قیمت: ۔/۳۰۰ روپے

یکے از مطبوعات:

ابلاغ پبلشرز، مین مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

مشمولات:

دیباچہ

سیدہ افصح وحید

ایم۔اے (اردو) سال اول کے نتیجے کے پیش نظر مجھے مقالہ تحریر کرنے کا جواز اور اعزاز ملا جس کا موضوع ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی رہنمائی میں ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس'' تجویز کیا گیا۔ غالبیات سے متعلق یہ مقالہ میرے لئے باعثِ افتخار بھی تھا اور وجہ اطمینان بھی۔ چند سال قبل ایم۔اے (اردو) کرنے کا سوال ہی میرے لئے بعید از قیاس تھا لیکن پھر گورنمنٹ کالج لاہور جیسے علمی بلندیوں کے حامل تعلیمی ادارے میں ایم۔اے (اردو) کی طالبہ کی حیثیت سے تحصیل اور اکتساب کی سہولت، اب ایک خواب کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی اور غالبیات کے حوالے سے ان کی وسیع النظری اہل نظر اور خصوصاً غالب فہموں کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی غالب پسندی کا ذکر کرتے ہوئے غالب پر اپنی پہلی کتاب ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے سرِ آغاز میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اپنی ذات کے حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ (غالب کی) ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیت سے میرا تعلق صرف ذہنی نہیں، جذباتی بھی ہے اور آج سے نہیں، شروع ہی سے ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالب کے دعویٰ نبوت:

گر شعر و سخن بہ دہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر این فن سخن دیں بودے
آں دیں مرا ایں کتاب آئین بودے

پر اسی وقت ایمان لے آئے تھے جبکہ

''مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار گلستاں پر''

اور پھر ڈاکٹر فرمان کا یہ کہنا کہ:

''مجھے آٹھویں جماعت سے غالب کا پورا دیوان یاد تھا''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری (حیات وخدمات) حصہ سوم، ص ۳۵۲)

ایک طرف تو غالب شناسوں کو دعوت فکر ونظر مہیا کرتا ہے تو دوسری طرف غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بلند پایہ تحریریں ان کی غالب شناسی کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی ہیں، انھی حقائق کے پیش نظر اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب سے عقیدت، لگاؤ اور تعلق کی نوعیت اور غالبیاتی تحقیق وتنقید میں ان کی مرتبت ومنزلت کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

بحیثیت غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی خدمات کے اس جائزے کو میں نے گیارہ (۱۱) ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سوانحی خاکہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں کردار اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان کے شخصی امتیازات کو متعارف کروانے کی سعی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا شمار پاکستان کے ممتاز غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ غالب پر ان کی پہلی تحریری کاوش مئی ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی۔ تیسرے باب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے پہلے غالب شناسی کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کی غرض سے قیام پاکستان، اگست ۱۹۴۷ء سے وسط ۱۹۵۲ء تک غالب شناسی کی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی پہلی کتاب ۱۹۷۰ء میں ''غالب، شاعرِ امروز وفردا'' کے عنوان سے اہل علم کے ہاتھوں میں آئی۔ یہ تصنیف پندرہ (۱۵) مقالات پر مشتمل ہے۔ چوتھے (۴) اور پانچویں (۵) باب میں ''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ خارجی تناسب وتوازن کے پیش نظر اس تجزیاتی مطالعے کو دو (۲) ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

''غالب، شاعر امروز وفردا'' (۱۹۷۰) کے پچیس (۲۵) برس بعد ۱۹۹۵ء

میں غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی دوسری تصنیف ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' شائع ہوئی۔ یہ پچیس (۲۵) برس بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

''دوسری علمی و ادبی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ غالب اور غالبیات کو سینے سے لگائے رہنے میں گزرے ہیں۔''

(''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، صفحہ ۵)

چھٹے باب میں ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے غالب سے والہانہ شغف اور ان کی دیدہ وری کو دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب فہمی کی لگن کا ایک تازہ نشانِ امتیاز ان کی ''شرح دیوانِ غالب'' ہے۔ یہ ابھی چھپی نہیں۔ مقالے کے ساتویں (۷) باب میں کتابی حجم کی حامل کوئی ۴۰۰ (چار سو) صفحات سے متجاوز اس غیر مطبوعہ شرح دیوان غالب کی غرض و غایت اور اس کی ضرورت سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ شرح سے متعلق مقالے میں شامل تمام تر معلومات مجھے ۱۸ اپریل ۱۹۹۶ء کو لاہور میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے گفتگو کے نتیجے میں میسر آئیں۔

''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے دیباچے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

''غالب صدی کے بعد سے اب تک میں نے یوں تو غالب کے سلسلے میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں صرف چند مقالات شامل ہیں''

بلاشبہ ڈاکٹر فرمان نے غالب پر اپنی دو مستقل تصانیف کے علاوہ بھی غالب پر بہت کچھ لکھا ہے، جو مختلف اوقات میں مختلف ادبی رسالوں اور مجلوں کی زینت بنتا رہا اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ آج ان کا شمار ممتاز غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ مقالے کے آٹھویں (۸) باب میں ڈاکٹر فرمان کے غالب سے متعلق ان غیر مرتب مقالات کا تجزیہ کیا گیا ہے جو غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی دو مستقل تصانیف کا حصہ نہیں لیکن غالبیات کے حوالے سے اپنا ایک الگ ادبی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

مقالے کا نواں (۹) باب بہت حد تک ان تبصروں کا احاطہ کرتا ہے جو ڈاکٹر فرمان

فتحپوری نے غالب سے متعلق مختلف نقادوں کی تصانیف، غالب سے متعلق رسالوں اور غالبیات سے تعلق رکھنے والی دوسری ادبی حیثیت کی حامل تالیفات پر وقتاً فوقتاً کئے۔ان میں سے بیشتر تبصرے ماہنامہ ''نگار'' میں شائع ہوئے۔ان تبصروں کو بلاشبہ بقول امراؤ طارق:

''تنقیدی مضامین کی حیثیت حاصل رہی ہے''

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، حصہ دوم، ص ۷۶۵)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب سے متعلق نگارشات جہاں ان کی غالب شناسی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، وہاں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے معتقد و مداح غالب کے طور پر بہت سے غالب شناسوں کی غالب فہمی کو ان کی کاوشوں کے حوالے سے متعارف کروایا ہے۔اس کارِ نیک میں ''نگار'' ایک وسیلہ ثابت ہوا جس کے متعدد شماروں میں ڈاکٹر فرمان نے غالب پر مختلف غالب شناسوں کی تصانیف کو جزواً یا مکمل طور پر شائع کیا اور اس طرح غالب پر بہت سی ایسی تصانیف جو نایاب تھیں، وہ دستیاب ہوئیں۔مقالے کا دسواں باب انہیں متعارفات سے متعلق ڈاکٹر فرمان کی مساعی کا احاطہ کرتا ہے۔

مقالے کے گیارہویں (۱۱) اور آخری باب میں بطور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مقام و مرتبے کے تعین کی اپنی سی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر سید معین الرحمن کی دو تحریریں فرمان صاحب کی غالب شناسی کی تفہیم کے سلسلے میں بڑی راہ کشا ہیں۔۔۔۔ان قیمتی تحریروں کو ضمیموں کے طور پر مقالے میں محفوظ اور شامل کر لیا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں ''کتابیات'' (Bibliography) کے زیرِ عنوان دورانِ تکمیل جن اصلی (Original) اور ثانوی (Secondary) مآخذات سے استفادہ کیا گیا، ان کی تفصیل دے دی گئی ہے۔

مقالے کی تکمیل کے لئے مواد کی فراہمی کے مراحل اور لائبریریوں میں ضروری علمی سرمائے کی کمی یقیناً ایک بڑا مسئلہ تھا۔مجھے اس مشکل سے نبرد آزما ہونے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے سے استاد محترم ڈاکٹر سید معین الرحمن کے ذاتی کتب خانے نے کلیتاً بچا لیا اور اس طور تمام مواد کا حصول سہل ہوا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن نے نہ صرف اپنے ذاتی کتب خانے تک رسائی اور بعض نادر و نایاب کتب سے استفادہ کرنے کی اجازت دی بلکہ مقالے کی تکمیل کے دوران ہر کٹھن مرحلے پر وہ شجر سایہ دار بنے رہے اور اس طرح میرے لئے مقالہ لکھنا اور وہ بھی ڈاکٹر فرمان فتحپوری جیسی بلند پایہ شخصیت کے متعلق لکھنا ممکن ہوا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کے زیر شفقت میری ابتدائی کاوش پایۂ تکمیل تک پہنچی جس کے لئے میں اپنے محترم استاد کی صدق دل سے ممنون ہوں۔ خدا انہیں صحت کامل اور عمر دراز عطا کرے (آمین)

مقالے کی تکمیل میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کے علاوہ عمو جان (ڈاکٹر سید معراج نیر زیدی) اور اماں (مسز رباب زیدی) نے بھی جس طرح میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے پدرانہ اور مادرانہ شفقت سے نوازا، وہ شکریے کے چند الفاظ کی متحمل نہیں۔ یہی نہیں بلکہ مقالے کا کچھ حصہ ان کے ہاں قیام کے دوران ہی لکھا گیا، جس کے لئے میں اپنے ان دونوں بزرگوں کی حد درجہ شکر گزار ہوں۔ خدا ان کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے (آمین)۔

اس جہان فانی میں میرا وجود اور پھر اس مقام تک رسائی بلا شبہ والدین کی رہنمائی اور قربانیوں کی مرہون منت ہے، جس کے لئے میں ماں جی اور ابو جان کی احسان مند ہوں، خدا انہیں ہمیشہ سلامت اور مہربان رکھے (آمین)۔ ماں جی اور ابو کے علاوہ شائستہ، فائزہ اور بطورِ خاص محمد علی رضا کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے تعاون کی بدولت میرے لئے مقالہ لکھنا ممکن ہو سکا۔ ان کے ساتھ اپنی محترم رفیق شکیلہ شاہجہان کے لئے بھی ڈھیروں دعائیں اور نیک خواہشات جنہوں نے مشکل مراحل میں میری ہر ممکن دل جوئی کی۔

آخر میں، میں ابلاغ پبلشرز کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری اس ابتدائی کاوش کو انتہائی سلیقہ مندی سے شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

۲۰۰۲ء

سیّدہ افصح وحید

لیکچرار شعبہ اردو،

گورنمنٹ کالج برائے خواتین، وحدت کالونی لاہور

نقاد، ادب اور غالب : میرا ایقان اور عقیدہ

نقاد کی زندگی یہ نہیں کہ اس کی رائیں درست ہوں اور ان کو مان لیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس کی رائے سے خواہ اختلاف کیا جائے لیکن اس کی رائے کا ہمیشہ حوالہ دیا جائے۔۔۔نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ تخلیقی قوت رکھتا ہو اور تخلیقی عمل کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے بھی واقف ہو، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اُن سارے علوم متداولہ پر کسی نہ کسی حد تک نظر رکھتا ہو، جس سے کسی خاص عہد کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔نقاد کو خیالات وافکار کے ساتھ زبان کا نباض بھی ہونا چاہیے، بھونڈے پن سے کوئی بات کہنے کا نام ادب نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

غالب کا اثر صرف جدید شاعری ہی پر نہیں، غالب کے بعد سارے اردو ادب پر نظر آتا ہے۔اس میں نثر اور شاعری دونوں ہی شامل ہیں۔۔۔اپنے خطوط کے ذریعے غالب نے اردو نثر کو وہ لب ولہجہ دیا جو بعد کو سرسید وحالی و مولوی عبدالحق کی علمی وادبی نثر کا رہنما بن گیا اور شاعری کی صورت تو یہ ہے کہ غالب کے بعد کی ساری اردو شاعری، خواہ اس کا تعلق رنگ قدیم سے ہو یا جدید سے، کسی نہ کسی طور پر غالب سے متاثر نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

پہلا باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: سوانحی خاکہ

سید دلدار علی فرمان فتح پوری، نام کے دلدار، اور تخلص کے فرمان ہیں ۔ ۔ ۔ اردو غزل شاہد ہے کہ دلدار کبھی فرماں بردار نہیں ہوتا، فرماں روا ضرور ہوتا ہے اور فرمان صاحب تو فتح پور کے بھی ہیں کہ فتح آدھی نہیں، پوری چاہتے ہیں۔

سجاد باقر رضوی

آج پاکستان کے صفِ اول کے ادیبوں اور ممتاز ترین شخصیتوں کی کتنی ہی مختصر فہرست بنایئے، اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نام ضرور شامل ہوگا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان یا کسی اور سہارے سے یہاں تک نہیں پہنچے، سماج میں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے انہیں ایک غیر معمولی جدو جہد کرنی پڑی۔

ڈاکٹر خلیق انجم

سوانحی خاکہ:

نام: سیّد ولدار علی

قلمی نام: فرمان فتحپوری

تاریخ ولادت: ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء

مولد: فتحپور (ہسوہ) یو۔ پی، ہندوستان

والد کا نام: سید عاشق علی (متوفی ۱۹۳۳ء)

دادا کا نام: سید عمر علی

قومیت و وطنیت: پاکستانی

قومی اعزاز: ستارۂ امتیاز (۱۹۸۵ء)

موجودہ مصروفیت۔ مدیر اعلیٰ، ماہنامہ نگار، کراچی، پاکستان
ممبر سندھ پبلک سروس کمیشن

سابقہ مشاغل و مناصب:

(۱) ۱۹۴۶ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے فوراً بعد مدرسہ اسلامیہ (مسلم ہائی اسکول فتح پور) میں انگریزی اور ریاضی کے ٹیچر ہو گئے۔

(۲) ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء آڈٹ ڈیپارٹمنٹ کے تحت بحیثیت پروبیشنر ڈویژنل اکاؤنٹینٹ، اے جی پی آر، سے وابستہ رہے۔

(۳) ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء سررشتہ تعلیم کراچی کے تحت گورنمنٹ ہائی اسکول، کوتوال بلڈنگ، کراچی میں ریاضی اور انگریزی کے معلم رہے۔

(۴) اگست ۱۹۵۸ء میں شعبہ اردو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر و صدر شعبہ کے منصب تک پہنچے۔

(۵) ۱۹۸۵ء میں وفاقی حکومت نے اردو ڈکشنری بورڈ کے لئے انکی خدمات مستعار لیں چنانچہ وہ ایک سال بیک وقت شعبہ اردو، جامع کراچی اور اردو ڈکشنری بورڈ کے نگران رہے۔

(۶) ۱۹۸۶ء کے اوائل میں اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے چیف ایڈیٹر اور سیکرٹری مقرر ہوئے۔

تعلیمی کوائف:

ڈاکٹر فرمان نے ناظرہ قرآن اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستان، بوستان، دستور الصبیان، مصدر نامہ، کریما و مامقیمان وغیرہ گھر میں والد صاحب اور چچا اور چچی سے پڑھیں۔ اس کے علاوہ فتحپور کے قیام میں مدرسۂ اسلامیہ کے مولوی محمد اسحٰق اور مولوی سید عبد الوحید سے دو سال نجی طور پر عربی و فارسی پڑھی۔ ڈاکٹر فرمان نے اپنے آبائی گاؤں کے پنڈت مہابیر پرشاد سے ہندی زبان کے ساتھ ساتھ رامائن کا خصوصی درس بھی لیا۔

والد کی وفات کے بعد ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر فرمان رسمی تعلیم کے لئے سرکاری ابتدائی مدرسے میں داخل ہوئے اور بتدریج تعلیم کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔

۱۔ ۱۹۴۱ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ ورنیکلر مڈل پاس کیا۔

۲۔ ۱۹۴۲ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے درجہ اول میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔

۳۔ ۱۹۴۸ء میں الہ آباد، یو پی سے سیکنڈ ڈویژن میں ایف۔ اے کیا۔

۴۔ ۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔

۵۔ ۱۹۵۳ء میں ایس ایم لاء کالج کراچی سے ایل ایل بی کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۶۔ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج ٹیچرز ٹریننگ کالج کراچی سے بی۔ ٹی سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔

۷۔ ۱۹۵۸ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔

۸۔ ۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے ''اردو کی منظوم داستانیں'' کے عنوان سے تحقیقی کام کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

۹۔ ۱۹۷۴ء میں ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' نامی کتاب پر کراچی یونیورسٹی میں ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

شادی:

۱۹۴۷ء میں خالہ زاد بہن سلمٰی بیگم سے ہوئی۔

بھائی:

سید شمشاد علی

بہنیں:

(۱) سیدہ خاتون

(۲) طیبہ خاتون

بیٹے:

(۱) سید ابرار علی

(۲) سید ابصار علی

بیٹیاں:

(۱) شمیم سلمان

(۲) نجمہ ہاشمی

(۳) وسیم صلاح الدین

(۴) عظمٰی فرمان

تصانیف وتالیفات:

۱۔	اردو رباعی کا فنی وتاریخی ارتقاء	کراچی رلاہور ۱۹۶۲ء
۲۔	تحقیق وتنقید	کراچی ردہلی ۱۹۶۲ء
۳۔	تدریس اردو	کراچی راسلام آباد ۱۹۶۲
۴۔	مولانا جوہر، حیات اور کارنامے	کراچی رلاہور ۱۹۶۹ء
۵۔	غالب شاعر امروز وفردا	لاہور ۱۹۷۰ء
۶۔	اردو کی منظوم داستانیں	کراچی ۱۹۷۰ء
۷۔	نواب مرزا شوق کی مثنویاں	لاہور ۱۹۷۲ء
۸۔	دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی جائزہ	لاہور ۱۹۷۲ء
۹۔	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	لاہور ۱۹۷۲ء
۱۰۔	قمر زمانی بیگم	لاہور رکراچی ۱۹۷۲ء
۱۱۔	زبان اور اردو زبان	کراچی ۱۹۷۳ء
۱۲۔	اردو کی نعتیہ شاعری	لاہور ۱۹۷۴ء
۱۳۔	نیا اور پرانا ادب	کراچی ۱۹۷۴ء
۱۴۔	ارمغان گوکل پرشاد	کراچی ۱۹۷۵ء
۱۵۔	میر انیس حیات اور شاعری	کراچی ۱۹۷۶ء
۱۶۔	ہندی اردو تنازع	کراچی راسلام آباد ۱۹۷۶
۱۷۔	قائد اعظم اور تحریک پاکستان	لاہور ۱۹۷۶ء
۱۸۔	ڈاکٹر محمود حسین، شخصیت اور کارنامے	لاہور ۱۹۷۶ء
۱۹۔	مولانا حسرت موہانی، شخصیت اور فن	لاہور ۱۹۷۷ء
۲۰۔	اردو املا رسم الخط	کراچی رلاہور ۱۹۷۷ء
۲۱۔	اقبال سب کے لئے	کراچی ردہلی رلاہور ۱۹۷۷ء
۲۲۔	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	کراچی ردہلی ۱۹۸۲ء

۲۳۔ دید و باز دید (سفرنامہ) — ملتان ۱۹۸۳ء

۲۴۔ خطبات محمود — لاہور ۱۹۸۳ء

۲۵۔ فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت — کراچی/لاہور ۱۹۸۴ء

۲۶۔ تاویل و تعبیر — لاہور ۱۹۸۴ء

۲۷۔ امراؤ جان ادا (معہ مقدمہ) — لاہور ۱۹۸۴ء

۲۸۔ نیاز فتح پوری شخصیت اور فن — کراچی ۱۹۸۶ء

۲۹۔ اردو کی ظریفانہ شاعری — لاہور/دہلی ۱۹۸۷ء

۳۰۔ اردو کا افسانوی ادب — ملتان/دہلی ۱۹۸۸ء

۳۱۔ نیاز فتح پوری دیدہ و شنیدہ — لاہور ۱۹۸۹ء

۳۲۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء — کراچی/دہلی/لاہور ۱۹۸۹ء

۳۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء — کراچی/دہلی/لاہور ۱۹۹۰ء

۳۴۔ اردو املاء اور قواعد — اسلام آباد ۱۹۹۰ء

۳۵۔ اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ — کراچی ۱۹۹۰ء

۳۶۔ قومی یکجہتی، اردو اور پاکستان — کراچی ۱۹۹۱ء

۳۷۔ اردو کی بہترین مثنویاں — لاہور ۱۹۹۳ء

۳۸۔ ادبیات اور شخصیات — لاہور ۱۹۹۳ء

۳۹۔ سری پرکاش اور پاکستان — لاہور ۱۹۹۳ء

۴۰۔ غزل، اردو کی شعری روایت — کراچی ۱۹۹۵ء

۴۱۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب — کراچی ۱۹۹۵ء

۴۲۔ SIR SYED AHMED KHAN ON THE PRESENT STATE OF INDIAN POLITICS — LAHORE 1982

۴۳۔ PAKISTAN MOVEMENT AND HINDI-URDU CONFLICT" 1986, LAHORE

۴۴۔ ادب اور ادب کی افادیت ۱۹۹۶ء

۴۵۔ ادا جعفری : شخصیت اور فن ۱۹۹۸ء

۴۶۔ میر کو سمجھنے کے لیے ، لاہور، الوقار پبلیکیشنز ، ۱۹۹۹ء

۴۷۔ بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں (غیر مطبوعہ)

۴۸۔ شرح دیوان غالب (غیر مطبوعہ)

مقالات:

تین سو کے لگ بھگ تحقیقی وتنقیدی مقالات اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

تبصرے:

تقریباً چھ سو کتابوں پر تبصرے لکھے۔ جن میں مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ طویل تبصرے ''باب انتقاد'' کے تحت ماہنامہ ''نگار'' میں شائع ہوئے اور بقول امراؤ طارق ''ان تبصروں کو تنقیدی مضامین مضامین کی حیثیت حاصل رہی ہے۔''(۱) تبصروں کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

اداریے:

۱۹۶۲ء سے ہر مہینے ''ملاحظات'' کے عنوان سے ماہنامہ ''نگار'' پاکستان کے اداریے لکھ رہے ہیں، جن کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے۔

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک نظر میں'' مضمون نگار امراؤ طارق۔
مشمولہ: ڈاکٹر فتحپوری (حیات وخدمات) ص ۶۵ ۷ حصہ دوم

دیباچے اور مقدمات:

دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تقریباً پچاس کتابوں پر دیباچے اور مقدمات لکھے ہیں۔ان میں سے بعض مقدمات بلند پایہ تحقیقی و تنقیدی مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مکتوبات:

مختلف ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت کا سلسلہ تقریباً پچاس سال سے قائم ہے۔ان خطوط میں علمی اور ادبی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ان مکتوبات کا انتخاب بھی شائع ہو تو یہ سلسلہ کئی جلدوں میں سمائے۔

مذاکرے اور کانفرنسیں:

ٹی وی اور ریڈیو پر گفتگو کے علاوہ قومی و بین الاقوامی سطح کے متعدد مذاکروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی، مقالے پڑھے اور صدارت کی۔

سلسلہ نیاز و نگار:

''نگار'' ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔جنوری ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادارت میں کراچی سے شائع ہونے لگا اور کراچی سے یہ علمی و ادبی ماہنامہ پابندی وقت اور اعلیٰ معیار کے ساتھ تا حال جاری ہے۔غالب پر اس کے مندرجہ ذیل خصوصی شمارے اور سالنامے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادارت میں نکل چکے ہیں:

۱۔	غالب صدی نمبر	جنوری، فروری ۱۹۶۹ء
۲۔	غالب بنگاہِ نیاز نمبر	نومبر ۱۹۸۷ء
۳۔	بسلسلہ مضامین ڈاکٹر ظ۔انصاری و شمس الرحمٰن فاروقی	اکتوبر ۱۹۸۸ء
۴۔	غالب کے خطوط	فروری ۱۹۸۸ء
۵۔	غالب کی فارسی غزل	جنوری ۱۹۹۲ء
۶۔	غالب اور تصوف	جولائی ۱۹۹۲ء
۷۔	''غالب شکن'' کا پہلا ایڈیشن	اپریل ۱۹۹۴ء
۸۔	''مشکلات غالب''	اکتوبر ۱۹۹۳ء، جنوری

۱۹۹۴ء، مئی ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے زیر نگرانی جن شخصیات نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ جات تحریر کئے، ان میں مندرجہ ذیل اہل علم شامل ہیں:

۱۔	ڈاکٹر نسیم سلطانہ	داستان امیر حمزہ کا تہذیبی مطالعہ	۱۹۷۴ء
۲۔	ڈاکٹر شاہدہ بیگم	سندھ میں اردو کا ارتقاء	۱۹۷۸ء
۳۔	ڈاکٹر امت الحمید	سرسید اور ان کے رفقاء کار کی علمی خدمات	۱۹۸۰ء
۴۔	ڈاکٹر محمد احسان الحق اختر	پروفیسر حمید احمد خان، احوال و آثار	۱۹۸۲ء
۵۔	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	نیاز فتحپوری، احوال و آثار	۱۹۸۶ء
۶۔	ڈاکٹر سلیم ملک	سید امتیاز علی تاج، زندگی اور فن	۱۹۸۸ء
۷۔	ڈاکٹر نجیب الدین جمال	یاس یگانہ چنگیزی	۱۹۹۰(۱)

ممالک جن کی سیاحت کی:

امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، فرانس، سعودی عرب، چین، مسقط، خلیج فارس اور بھارت۔

اعزازات:

۱۔ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۱۹۸۵ء میں غیر معمولی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ''ستارہ امتیاز'' کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری پاکستانی جامعات کے پہلے پروفیسر ہیں جو اردو زبان و ادب سے متعلق بیک وقت پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں رکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ اسی کے سبب کراچی یونیورسٹی کے چانسلر اور گورنر سندھ نے طلائی تمغہ عطا کیا۔

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری، بطور محقق''، مقالہ نگار: نورین فردوس، ص ۱۹، ۲۰

۳۔ کراچی یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے پانچ بار انعامات کی صورت میں ان کے تحقیقی کاموں کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

۴۔ دو بار رائٹرز گلڈ پاکستان کی طرف سے داؤد ادبی ایوارڈ کے مستحق قرار پائے۔

۵۔ معروف فلاحی ادارے ''تنظیم برادران پاکستان'' کی جانب سے انہیں ۱۹۸۷ء میں ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

۶۔ ۱۹۸۸ء میں کراچی کے شہریوں کی جانب سے ڈی۔ آئی۔ پی ادبی ایوارڈ کے ذریعے ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

۷۔ ۱۹۸۹ء میں ''یونی کیرین'' یونیورسٹی آف کراچی کی جانب سے ڈاکٹر فرمان کو نشان فضیلت عطا کیا گیا۔

۸۔ ۱۹۹۰ء میں جشن فیض کمیٹی کی طرف سے ''فیض احمد فیض'' ایوارڈ پایا۔

۹۔ ۱۹۹۱ء میں ''فرسٹ کراچی سٹیزن ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔

۱۰۔ ۱۹۹۲ء میں ''نشان سپاس'' کے عنوان سے ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

۱۱۔ ۱۹۹۳ء میں برصغیر میں نعت گوئی پر پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ''نعت اکیڈمی ایوارڈ'' دیا گیا۔

۱۲۔ ۱۹۹۴ء میں ''کینیڈین اکیڈمی آف اردو لٹریچر'' کی جانب سے ٹورنٹو میں ''انٹرنیشنل اردو ایوارڈ'' دینے کا اعلان کیا گیا۔ اسی سال نیویارک میں ''جشن فرمان'' کا اہتمام کیا گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری جب خود اپنا ذکر کرتے ہیں تو کچھ اس طرح کہتے ہیں:

''اپنے اطوار و عادات کو، اپنے ذوق و شوق کو اور اپنے مزاج و افتادِ طبع کو بیک وقت سامنے رکھ کر جب میں اپنے بارے میں غور کرتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے میں:

فطرتاً آدمی ہوں ۔۔۔

تادیاً انسان ہوں،
مذہباً مسلمان ہوں،
نسباً سید ہوں
مسلکاً حنفی ہوں
مشرباً بریلوی ہوں
عقیدتاً موحد ہوں
ذوقاً شاعر ہوں
مزاجاً صوفی ہوں'' (۱)

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک نظر میں''، مضمون نگار امراؤ طارق
مشمولہ: ڈاکٹر فتح پوری (حیات وخدمات)، حصہ دوم، ص۱۴۷۷

دوسرا باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: کردار اور شخصیت

فرمان صاحب کی شخصیت میں کوئی خوبیاں ایسی ہیں جن پر رشک کیا جا سکتا ہے اور ان کے علمی کاموں میں کئی خصوصیتیں ایسی ہیں جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔۔ان کی شخصیت میں دلآویزی کتنی اور کیسی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو بھی ان سے آزردہ نہیں پایا، یا یوں کہیے کہ اظہارِ رنجیدگی کرتے ہوئے نہیں پایا، جن کی اس صلاحیت میں کسی کو شک نہیں اور جس کا اظہار بے محابا ہوتا رہتا ہے! فرمان صاحب کی شخصیت ''وضع داری'' کی قد آدم آئینہ دار ہے۔اس کی کارفرمائی ان کے مزاج کا جز اور طبیعت کا تقاضا ہے۔۔مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوشش کر کے بھی اپنے آپ کو اس کے تقاضوں سے بے تعلق رکھنے پر قابو یافتہ نہیں ہو پائیں گے۔۔عادت ہو تو بدل جائے، فطرت کو کون بدل سکتا ہے۔

رشید حسن خاں

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اچھے انسان ہیں، بڑا اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ آج کل یہ لفظ بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔دوسروں کے لئے رونقِ محفل، اپنے کام میں منہمک اور اپنے آس پاس سے مطمئن بھی۔۔کبھی ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ادیبوں کے بیچ رہتے ہیں اور خلاف دستور کسی سے شاکی بھی نہیں۔۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری قابل قدر ہیں، ایسے ہی لوگ زندگی کی تہذیبی فضا کو خوب صورت بنا دیتے ہیں۔حیرت تو اس بات پر بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ اردو ادب میں نہایت معتبر اور محترم مقام پر ہوتے ہوئے بھی آج تک قطعی غیر متنازع شخصیت ہیں۔آج کے دور میں یہ ایک نا قابلِ یقین سی حقیقت ہے۔

ادا جعفری

کردار اور شخصیت:

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نام جس قدر محترم اور بلند ہے، اسی قدر ان کی شخصیت بھی عظمتوں کی حامل ہے، وہ ایک جامع اور پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں جس کا ہر زاویہ ہمارے سامنے واضح اور روشن ہے۔

ظاہری شکل وصورت میں متوسط قد، امت وسطیٰ کے فرد ہونے کی نشانی، گول وجیہہ چہرہ، روشن اور تیز آنکھیں، پیشانی فراخ، صاف رنگ، بال جوانی ہی میں سفید ہو چلے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ، گفتگو میں شادابی اور شگفتگی (۱)۔۔۔۔آنکھوں میں ایک ایسی چمک جو ذہانت کے علاوہ دلی کشادگی اور شگفتگی کی بھی علامت ہوتی ہے۔ آواز میں ٹھہراؤ۔(۲)

وہ حلیم الطبع، ملنسار، پرخلوص اور وضعدار ہیں۔ ان کا علم وفضل ان کو تعلّی کی طرف نہیں لے گیا بلکہ خلوص اور محبت کی طرف لے گیا ہے، جو ہمارے اسلاف کا شیوہ ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس رتبے اور عمر کو پہنچنے کے بعد بھی ایک جان فشاں اور انتھک ادبی کارکن ہیں۔ ادبی BEUROCRAT یا SNOB نہیں۔(۳)

تحمل، درگزر، رواداری اور صلح پسندی فرمان صاحب کی شخصیت کے بنیادی جوہر ہیں۔ تکلف اور تصنع انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا۔(۴)

۱۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت''، مضمون نگار، ڈاکٹر تنویر عباسی
ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔ حیات وخدمات، مرتبہ امراؤ طارق، ص ۳۳

۲۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں، شخصیت اور فن کے حوالے سے)''، مضمون نگار میرزا ادیب (لاہور)۔ ڈاکٹر فتحپوری۔۔۔ حیات وخدمات مرتبہ امراؤ طارق، ص ۲۰

۳۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت''، مضمون نگار ڈاکٹر تنویر عباسی
ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔۔ حیات وخدمات، مرتبہ امراؤ طارق، ص ۳۰

۴۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری (اردو ادب کی شعاع صد رنگ)''، مضمون نگار ڈاکٹر احسان الحق۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔ حیات وخدمات، مرتبہ امراؤ طارق، ص ۸۸

فرمان صاحب کا رویہ معتدل ہے۔ وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں۔۔محنت کے ساتھ ساتھ فرمان صاحب میں تدبر اور حلم بھی بہت ہے۔(۱) وہ چیخنے، چلانے اور شور مچانے پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

جن اصحاب کو فرمان صاحب کے اپنے قلم سے نکلے ہوئے مسودات یا خطوط دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ بڑے بڑے جلی لفظوں میں کھلا کھلا لکھتے ہیں۔ جو عبارت فرمان صاحب تین صفحوں میں رقم کرتے ہیں، گنجان خط میں لکھنے والا اسے زیادہ سے زیادہ ایک آدھ صفحے میں سمیٹ سکتا ہے۔ فرمان صاحب کا یہ کھلا کھلا لکھنے کا انداز ان کی کشادہ ظرفی اور فراخ دلی کا عکاس ہے۔ یہ کشادہ ظرفی اور فراخ دلی فرمان صاحب کے معاشرتی رویوں میں ہر جگہ پھوٹی پڑتی نظر آتی ہے۔(۲)

فرمان صاحب مزاج کے اعتبار سے سادہ اور عام دنیاوی تکلفات سے بے نیاز ہیں۔ وہ کھانے پینے میں کوئی تکلف، نہ لباس میں کوئی غیر معمولی احتیاط، صاف ستھرے عمدہ کپڑے پہنتے ہیں۔ اچھا اور شاندار مکان ہے، سلیقے سے رہتے ہیں۔ حفظ مراتب کے بہت قائل ہیں۔ ایک دفعہ رباعی کے حوالے سے شادانی صاحب سے ان کی علمی بحث ہوئی۔ یہ بحث تحریر میں ہوئی۔ شادانی صاحب بڑے آدمی تھے، چھوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ فرمان صاحب سے اختلاف رائے ہوا تو انہوں نے اپنے مضمون کا لہجہ جارحانہ رکھا اور ناملائم الفاظ استعمال کیے۔ فرمان صاحب نے پوری بحث میں ادب اور شادانی صاحب کے مرتبے کا خاص خیال رکھا۔ بحث کی لیکن بڑے انکسار اور عاجزی کے ساتھ۔(۳)

فرمان صاحب علمی اور دنیاوی سطح پر کسی سے مرعوب بھی نہیں ہوتے۔ ہر شخص سے

۱۔ فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔۔ایک تاثر)، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔حیات و خدمات، مرتبہ امراؤ طارق، ص ۳۵)

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری (اردو ادب کی شعاع صدرنگ)، مضمون نگار ڈاکٹر احسان الحق، ص ۹۰

۳۔ فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ایک تاثر) مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۱۴۱

برابری کی سطح پر آزادانہ اور بے تکلفانہ ملتے ہیں۔ با اصول آدمی ہیں۔(۱)

فرمان صاحب شروع ہی سے ایک محنتی، ذہین اور ہمہ شغل طالب علم رہے۔ کھیل کود، بیت بازی، مباحثہ، مشاعرہ، کشتی، اکھاڑہ، دنگل، میلہ ٹھیلہ، لڑائی جھگڑا سب میں دلچسپی لیتے تھے اور آگے آگے رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ پڑھنے میں سب سے تیز تھے۔ پرائمری اسکول میں، مڈل میں اور ہائی اسکول میں سب میں اول درجے میں پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے اور سرکاری وظائف حاصل کیے۔(۲)

فرمان صاحب کو اردو اور ریاضی سے یکساں دلچسپی تھی۔ دونوں میں ہمیشہ ان کو امتیازی نشانات ملتے تھے۔۔۔ میٹرک تک ریاضی کے پرچوں میں جہاں یہ لکھا ہوتا کہ ''کوئی سے پانچ سوال حل کیجیے''، انہوں نے سارے سوالات حل کیے اور کاپی کے اوپر لکھ دیا کہ ''کوئی سے پانچ جوابات دیکھ لیجیے۔'' میٹرک کرنے کے بعد جب وہ اسی اسکول میں ماسٹر ہو گئے تو بھی نویں اور دسویں جماعت کو حساب ہی پڑھاتے تھے۔(۳)

تصنیف و تالیف کا شوق فرمان صاحب کو ہمیشہ سے ہے۔ جس زمانے میں وہ اسکول میں پڑھاتے تھے تو مختلف درسی کتابوں کی شرحیں لکھ ڈالیں، چونکہ موضوعات کے ماہر تھے، محنتی تھے، تالیفی سلیقے کے حامل تھے، اسی وجہ سے یہ شرحیں بھی بہت مقبول ہوئیں۔(۴)

یونیورسٹی آئے تو علمی کاموں کا شوق بڑھا۔ ریاضی پر کتاب لکھی، پھر جو سلسلہ چلا تو آج تک جاری ہے۔ کتاب پر کتاب، ایک سے ایک عمدہ، ایک سے ایک بہتر، ادب کے

۱۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۴۴

۲۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ''، مضمون نگار، ڈاکٹر شاہت علی خاں، صفحہ ۵۹

۳۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ''، مضمون نگار، ڈاکٹر شاہت علی خاں، صفحہ ۶۰

۴۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۱

بے شمار موضوعات پر حاوی۔ انہوں نے ہر صنف سخن پر لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اقلیم سخن میں تمام اصناف شامل ہیں۔ کوئی صنف اس قلمرو سے باہر نہیں۔ (۱)

فرمان صاحب نے ایم۔اے اردو بدرجہ اول کیا۔ اس زمانے میں وہ کسی سرکاری اسکول میں معلم تھے۔ مستقل ملازمت تھی اور غالباً اس ملازمت کو کئی برس بھی ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ان سے کہا کہ وہ اسسٹنٹ لیکچرر کی حیثیت سے شعبے میں آ جائیے، تحقیقی مقالہ لکھ لیجئے گا تو لیکچرر بن جایئے گا۔ فرمان صاحب نے ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہیں کیا، لگی بندھی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور شعبے میں آ گئے۔ یہ اپنے اوپر اعتماد اور اللہ تعالیٰ پر یقین کی بات تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جھجھکتا، سوچتا، دوستوں اور عزیزوں سے مشورہ کرتا، مگر فرمان صاحب کو اپنی محنت اور لگن پر اعتماد تھا، اور یہ اعتماد بے جا نہ تھا۔ وہ ''اسسٹنٹ لیکچرر ہو کر شعبے میں آئے تھے، پروفیسر اور صدر شعبہ ہو کر عزت اور احترام سے اردو ڈکشنری بورڈ گئے (۲) لیکن یہ مقام و مرتبہ ہر کسی کے نصیب اور دسترس میں نہیں ہوتا۔ یہ منزل محنت، لگن، جانفشانی اور اعتماد ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

فرمان صاحب کی لیاقت اور محنت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ انتہائی کم مدت میں مکمل کر دیا تھا۔ طلبہ عام طور پر چار پانچ برس لگاتے ہیں، مگر فرمان صاحب نے مقررہ مدت سے ایک دن بھی زیادہ نہیں لیا۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ (۳)

فرمان صاحب نے اردو ڈکشنری بورڈ میں بڑا مفید کام کیا۔

وہ کسی علمی کام میں ابا نہیں فرماتے، آپ ان کو کوئی موضوع دے دیں، انشاءاللہ اس پر بہتر سے بہتر مقالہ لکھ دیں گے۔ یہ خصوصیت بڑے سے بڑے فاضل

۱۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۱

۲۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۳۸

۳۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۳۷

کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ مسلسل محنت اور ان تھک کوشش ان کی زندگی کا اصول ہے(۱)۔

آج کے زمانے میں جس کو محنت، شوق، لگن اور عزم و حوصلہ کی تصویر دیکھنا ہو، وہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو دیکھے۔(۲)

میرزا ادیب نے جو ماہنامہ ''ادب لطیف'' کے مدیرانہ فرائض انجام دے رہے تھے، ''آوارہ گرد اشعار'' کے نام سے ایسے اشعار کی اچھی خاصی تعداد کو شائع کیا جن کے خالقوں کے نام نامعلوم تھے۔ایک روز انہیں ایک خط موصول ہوا جس میں ان تمام اشعار کے خالقوں کے نام موجود تھے جو آوارہ گرد شعر سمجھے گئے تھے۔ایک ایک شعر کے آگے اس کے خالق کا نام درج تھا اور ان تذکروں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا جن سے یہ نام لئے گئے تھے(۳)۔ یہ خط ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تھا۔طبیعت کا یہ حال اس وقت تھا جب ابھی ان کو ترقی کے بہت سے مدارج طے کرنا تھے۔

فرمان صاحب صرف صاحبِ تخلص نہیں، صاحبِ سخن بھی ہیں۔(۴)

ان کا ادبی ذوق اردو شاعری سے شروع ہوا تھا۔جب بھی کسی کی شادی ہو تو فرمان صاحب کا کہا ہوا سہرا پڑھا جاتا تھا۔جب بھی منظوم سپاس نامہ یا خراج عقیدت کا موقع ہو تو شعر گوئی کے لئے فرمان صاحب کی خوشامد کی جاتی تھی۔(۵)شعبہ اردو کی بعض محفلوں میں انہوں نے اپنا کلام سنایا ہے مگر نثر کی طرف توجہ ہونے کے بعد شاید انہوں نے شاعری کو پورا وقت نہیں دیا۔بہر حال وہ شاعر ہیں، زور و شور کے نہ سہی لیکن ہیں شاعر۔(۶)

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ص ۳۱

۲۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۴۲

۳۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے)'' مضمون نگار، میرزا ادیب، ص ۱۸

۴۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۴۲

۵۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ'' ڈاکٹر شاہت علی خان، ص ۵۰

۶۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۴۲

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''دلدار بھائی کے اندر مجھے ایک چھپا ہوا شاعر ملا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب کو فی البدیہہ شعر کہنے میں ایسا ملکہ ہے کہ شاید بہت سے پر گو شاعر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں لیکن اس خوبی کا اظہار کبھی کبھی ہوتا ہے۔(۲)

ان دنوں ابھی بال پین کا استعمال شروع نہ ہوا تھا اور فاؤنٹین پین اور ہولڈرز عموماً استعمال ہوتے تھے اور روشنائی کے لئے شیشے کی چوکور دوات ہوتی تھی جس پر ٹین کا چاندی کے روپے کے برابر ڈھکنا ہوا کرتا تھا۔ایک مرتبہ ڈاکٹر شہاب الدین انجم نے کمرۂ امتحان میں جہاں ششماہی امتحان ہو رہا تھا اور امراؤ طارق امتحان دینے والوں میں تھے، دوات کے ڈھکنے کی طرف اشارہ کیا جو فرمان صاحب کے قریب میز پر پڑا ہوا تھا اور کہا کہ''دلدار دیکھو، وہ روپیہ پڑا ہوا ہے، اٹھالو۔۔۔ڈاکٹر صاحب بولے،''امراؤ''۔۔۔۔

''نظر آتا ہے روپیہ ان کو ڈھکن روشنائی کا

بہت کمزور ہے ہے چشمِ انجم ہوئی جاتی ہے''

ڈاکٹر صاحب نے ذرا سے وقت میں برجستہ شعر کہا اور امتحان کا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور ماسٹر شہاب الدین انجم صاحب خجل ہو کر ہنسنے لگے۔(۳)

فتح پور میں ان کی وجہ سے شعر و شاعری کا مستقل ماحول قائم ہو گیا تھا۔شہر میں اور اسکول میں وہ مشاعرے کراتے تھے، اسکول کے سالانہ مشاعرے میں وہ خصوصاً پیش پیش رہتے تھے۔(۴)

۱۔ ''کتاب خوان ہے مگر صاحب کتاب بھی ہے''مضمون نگار، ڈاکٹر نسیم فاطمہ، ص ۸۳

۲۔ ''گیان کا درخت دعا کی چھاؤں''مضمون نگار، امراؤ طارق، ص ۱۱۱

۳۔ ''ایضاً''، ص ۱۱۰

۴۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ''مضمون نگار: ڈاکٹر شاہت علی خان، ص ۶۱

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک خوبصورت شاعر ہی نہیں ،ایک کامیاب Conversationist بھی ہمیشہ سے موجود ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے علم اور پیشے نے درجۂ کمال کو پہنچا دیا ہے۔وہ کبھی کبھی جب بالکل تنہا ہوتے ہیں ۔۔۔یا کسی واقعہ سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کا لب ولہجہ اپنے آپ سے گفتگو کرنے والا ہوتا ہے تو ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا سماں بندھ جاتا ہے۔وہ شخصیتوں اور موضوعات پر ایسی مدلّل ،مسحور کن ،پُر مغز اور فیصلہ کن گفتگو کرتے ہیں کہ شخصیت یا موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ پاتا،ایسی ہی کیفیت میں وہ غالب، اقبال، حسرت موہانی،نظیر اکبر آبادی،نیاز فتحپوری،جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر محمود حسین کے علاوہ اپنے پسندیدہ دوستوں ،شاعروں اور ادیبوں کا ذکر بڑی محبت واحترام سے کرتے ہیں ۔(۱)

۴۶۔۱۹۴۵ء کا زمانہ تحریک پاکستان کے شباب کا زمانہ تھا۔فرمان صاحب طالبعلموں کے رہنما کی حیثیت سے اس تحریک کے سرگرم رکن تھے۔پر جوش تقریر کرتے اور مسلم لیگ کے ہر جلسے میں بلائے جاتے تھے۔(۲) کانگریس اور کانگریس والوں سے مقابلے کے لئے روز نئے نئے منصوبے بناتے تھے۔ایک دن بیٹھے بیٹھے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم بھی اپنا فرض انجام دیں گے اور مسلمانوں کو متحد کریں گے۔چنانچہ طے پایا کہ صرف الفاظ سے نہیں،کردار سے قوم کے دل کو گرمانا ہے۔عملی صورت یہ نکالی گئی کہ سب لوگ علی الصبح اٹھنے کی عادت ڈالیں گے اور فجر کی نماز ضرور پڑھیں گے۔ایسا ہی کیا گیا،کڑاکے کی سردی میں ۵ بجے صبح تڑکے سے اٹھ کر فتح پور شہر کے کوچہ و بازار میں سڑکوں اور گلیوں میں ''مسلمانو،نماز پڑھو'' کا نعرہ لگاتے پھرتے تھے۔پہلے ان جلوسوں میں چند حضرات ہوتے تھے مگر بعد میں اللہ والوں کی تعداد بڑھی اور ان نعروں سے شہر فتح پور گونج اٹھا۔شہر کی ویران مساجد آباد ہو گئیں۔مسلمانوں کا پاپی من جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

۱۔ ''گیان کا درخت دعا کی چھاؤں'' مضمون نگار،امراؤ طارق،ص ۱۱۱

۲۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ'' مضمون نگار: ڈاکٹر شاہت علی خان،ص ۶۲

''من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا''

پنجگانہ نماز میں مشغول ہو گیا، نعرہ زنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور غیر مسلم قوم ان نعروں سے دہل گئی۔ (۱)

فرمان فتحپوری کا ذہن ایک سچے مسلمان کا ذہن ہے۔۔۔ایک سچے مسلمان کی طرح وہ ایک سچے پاکستانی بھی ہیں بلکہ۔۔۔ایک پرجوش پاکستانی ہیں۔ (۲)

قیام پاکستان کی کچھ مدت بعد بھارت میں ایک ادبی سیمینار منعقد ہوا تھا۔ پاکستان سے اس میں شمولیت کے لئے وفد گیا تھا۔ اس میں فرمان صاحب بھی شامل تھے۔ دوران اجلاس ایک بھارتی دانشور نے اپنی تقریر میں ایک ایسی بات کہی جس سے تقسیمِ ہند کی جغرافیائی تقسیم اور نظریہ پاکستان کی نفی ہوتی تھی۔ فرمان صاحب یہ بات برداشت نہ کر سکے۔ فوراً اٹھ کر کہنے لگے، تقسیم ہند ایک حقیقت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ پاکستان بنا ہے اور ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ سامعین جن میں بیشتر غیر مسلم بھارتی موجود تھے، ان سب پر سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد کسی مقرر کو پاکستان کے حوالے سے اس قسم کے منفیانہ نقطۂ نظر کے اظہار کی جرأت نہ ہو سکی۔ (۳)

فرمان صاحب ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے لیکن اپنی محنت و ذہانت اور شرافت کی وجہ سے وہ نوجوانی ہی میں شہر کے بڑے لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ پیسے یا عہدے کے لحاظ سے نہیں، عزت و احترام کے لحاظ سے۔ (۴)

ان کا اصل نام سید دلدار علی ہے۔۔۔ عام طور پر مشاہیر ادب اور شعراء تخلص کے نام میں پناہ لیتے ہیں مگر یہاں نام کا بدلنا ادبی ذوق پر نہیں بلکہ خاص احساساتی بنیاد پر

۱۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ'' مضمون نگار: ڈاکٹر شاہت علی خان، ص ۵۵

۲۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے) مضمون نگار: میرزا ادیب، ص ۲۶

۳۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ'' مضمون نگار: ڈاکٹر شاہت علی خان، ص ۶۴

مبنی ہے۔(۱) سید فرمان علی ان کے چچازاد بھائی اور دوست تھے۔ نوعمری میں ان کا اچانک انتقال فرمان صاحب کے لئے ایک سانحہ ثابت ہوا لیکن اس نام کو انہوں نے ایسا اپنا لیا کہ ایک لمحہ کو بھی خود سے جدا کرنا پسند نہ کیا۔ بچپن اور لڑکپن کی یادوں کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۳۸ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت سے فرمان میرے نام کا جزو بن گیا۔ لوگ میرا اصل نام بھول گئے اور سب اسی نام سے پکارنے لگے۔ میں خوش ہوں کہ میرے ساتھ میرا دوست زندہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صرف وہی زندہ ہے، میرا نام تو کوئی جانتا بھی نہیں''۔(۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری آزاد منش بھی ہیں اور تنوع پسند بھی۔ اس لئے نادر کسی سے متاثر کم ہوتے ہیں۔ ادب میں کتنی تحریکیں اٹھیں، گروپ بندیاں ہوئیں، کئی دبستان کھل گئے لیکن ان کی آزادیٔ فکر نے کسی ایک دائرے میں مقید ہونا پسند نہیں کیا بلکہ مختلف شعبوں میں مختلف لوگوں کے لئے خضرِ راہ بنے رہے۔ ڈاکٹر صدیقہ ارمان لکھتی ہیں:

''ایک اور صفت بھی ڈاکٹر صاحب کی قابلِ تحسین ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے اگر اس کا اندیشہ ہو تو اصولوں کی قربانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصول انسانوں کے لئے بنے ہیں، انسان اصولوں کے لئے نہیں۔''(۳)

ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ ادیبوں کے بیچ رہتے ہیں اور خلاف دستور کسی سے شاکی بھی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب قابل قدر ہیں، ایسے ہی لوگ زندگی کی تہذیبی فضا کو

۱۔ ''نصف صدی کا قصہ طویل خط کا ایک حصہ'' مضمون نگار: ڈاکٹر شاہت علی خان، ص ۵۱

۲۔ ''کتاب خوان ہے مگر صاحب کتاب بھی ہے'' مضمون نگار، ڈاکٹر نسیم فاطمہ، ص ۸۰، بحوالہ ''بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں'' (غیر مطبوعہ) ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص ۱۵

۳۔ ''کتاب خوان ہے مگر صاحب کتاب بھی ہے'' مضمون نگار، ڈاکٹر نسیم فاطمہ، ص ۸۱

خوبصورت بنا دیتے ہیں۔(۱)

فرمان فتحپوری ایک محقق ہیں، نقاد ہیں، ادبی مورخ ہیں، سیرت نگار ہیں، نعت نگار اور ایڈیٹر بھی مگر ذہنا اور قلبا ایک معلم ہیں اور یہ اس اعتبار سے کہ معلمی ایک پیشہ نہیں ہے، کم از کم یہ اس نوعیت کا پیشہ نہیں ہے کہ جس میں معاشی تقاضوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فرمان فتحپوری نے معلمی کو ایک قدس فریضے کی حیثیت دی ہے اور سود و زیاں سے ماورا رہ کر ایک مدت تک یہ فریضہ ادا کیا ہے۔۔۔۔ شاگرد سے بڑھ کر ایک استاد کا کون نقاد ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔ ان شاگردوں کی متفقہ رائے تھی کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری صحیح معنوں میں ایک استاد ہیں۔(۲)

فرمان صاحب بڑے محنتی استاد ہیں۔ پوری تیاری سے کلاس میں جاتے تھے اور ڈوب کر پڑھاتے تھے۔ شعبے کے طلبہ ان سے بہت متاثر تھے۔ شعبے سے فارغ ہونے کے بعد بھی اکثر طلبہ فرمان صاحب سے رابطہ رکھتے تھے۔ دراصل استاد اپنے طلبہ ہی سے پہچانا جاتا ہے۔۔۔ ویسے فرمان صاحب کے اساتذہ بھی ان کی لیاقت اور محنت کی داد دیتے تھے۔ مرحوم پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے اکثر فرمان صاحب کی لیاقت اور محنت کی تحسین کی۔ ایک دفعہ غضنفر صاحب نے فرمان صاحب کے حوالے سے یہ کہا کہ مجھے فرمان پر ناز ہے۔ غضنفر صاحب جیسا علم کا سمندر اگر اپنے کسی شاگرد پر ناز کرے تو اس شاگرد کا لائق ہونا مسلّم ہے۔(۳)

فرمان صاحب کلاس میں گئے تو خود بھی ہنس رہے ہیں، طلبہ بھی مسکرا رہے ہیں۔ وہ جو ایک خوامخواہ کی سنجیدگی اور خوف کا عالم بعض اساتذہ کی کلاسوں میں طاری ہوتا ہے، فرمان صاحب کی کلاسوں میں اس کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں ہوتا، پھر یہ کہ طلبہ کے

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری'' مضمون نگار ادا جعفری، ص ۴۶۔۴۷

۲۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے) مضمون نگار: میرزا ادیب، ص ۲۲

۳۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۳۷

ساتھ ان کا رویہ بزرگ دوست کا سا رہا۔ ناصح مشفق یا محتسب وہ کبھی نہیں بنے۔ فرمان صاحب مستعد اور باقاعدہ آدمی ہیں۔ وقت پر یونیورسٹی آنا، وقت پر کلاس لینا، میٹنگوں میں بہ پابندی وقت شرکت، لمبی گفتگو سے اجتناب، کام کی باتیں شگفتہ انداز میں، رفقائے کار کو دیکھ کر مسکرانا اور پھر زیر بحث مسائل میں بجے تلے انداز میں اظہار خیال۔ میٹنگوں میں فرمان صاحب کی شرکت سے ایک خوشگوار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔(۱)

فرمان صاحب ایک اچھے استاد، ادیب اور نقاد ہی نہیں، اعلیٰ درجے کے منتظم بھی ہیں۔ دوسروں سے کام لینے کے ہنر سے بھی پوری طرح واقف ہیں اور کام لینے کے لئے اپنے چھوٹوں کی تربیت بھی کرتے ہیں۔۔۔ مردم شناس فوراً پہچان لیتا ہے کہ کس شخص میں کیا صلاحیت ہے، کس کو کس کام پر لگانا چاہئے۔ تربیت کے لئے کیا انداز اختیار کرنا چاہئے۔ فرمان صاحب مردم شناس بھی ہیں، تربیت بھی کرتے ہیں اور ہر شخص سے اس کی صلاحیت واستطاعت کے مطابق کام بھی لیتے ہیں۔ (۲)

وہ اردو ادب میں نہایت معتبر اور محترم مقام پر ہوتے ہوئے بھی آج تک قطعی غیر متنازع شخصیت ہیں۔ آج کے دور میں یہ ایک ناقابلِ یقین سی حقیقت ہے۔(۳)

ان کی خاموشی میں جس طرح سمندر کی سنجیدگی ہے، اسی طرح ان کی گویائی میں دریا کی روانی بھی ہے۔۔۔ وہ بول رہے ہوں تو انہیں سنیئے اور سنتے ہی جائیں۔ سنجیدگی کو بھی شگفتگی سے بدل دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں جتنی گہرائی، سنجیدگی اور متانت ملتی ہے، گفتگو میں اتنی ہی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے۔ (۴)

۱۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، صفحہ ۴۳

۲۔ ایضاً، صفحہ ۴۴

۳۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری'' مضمون نگار، ادا جعفری، ص ۴۷

۴۔ ''علم و ادب کا چھتناور'' مضمون نگار، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ص ۶۵

ادبی جلسوں اور تقریبوں میں پہلے فرمان صاحب مضمون پڑھتے تھے۔ آج کل تقریر کرتے ہیں، تقریر بھی بے حد شگفتہ اور دلچسپ۔ کام کی ساری باتیں اپنے خوبصورت جملوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ادبی تقریب میں جان پڑ جاتی ہے۔ (۱) ۔۔۔ مگر یہ طریقہ ہر شخص نہیں برت سکتا۔ یہ اس کے لئے موزوں ہے جو خوش تقریر بھی ہو اور گفتار کے اسلوب پر قابو بھی رکھتا ہو۔ (۲) اور فرمان صاحب میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

عام طور پر لوگ اپنے سے بڑے لوگوں سے مل کر زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اونچی سوسائٹی میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں لیکن انہیں ان سب باتوں کا کوئی شوق نہیں۔ جتنا چھوٹا آدمی ہوگا، وہ اتنی ہی زیادہ محبت سے ملتے ہیں۔ (۳)

ڈاکٹر فرمان کو بہت کم لوگ برے لگتے ہیں۔ برے سے برے آدمی میں بھی وہ اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں اور ہمیشہ اس اچھائی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی انتہا ہے۔

اس سلسلے میں کوئی انہیں ٹوکے تو وہ مولانا محمد علی جوہر کی نعت کا یہ شعر سنا دیتے ہیں کہ:

کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں، برا میرے لئے ہے

اگر کبھی ان کو زندگی میں کسی سے الجھن یا تھوڑی سی چڑ محسوس ہوتی ہے تو وہ بیکار اور کاہل لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ بدنظمی، بے ادبی یا غیر شائستگی اور Indisciplined Life کو بھی سخت ناپسند کرتے ہیں۔۔۔ وہ جمود کے قائل نہیں، ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے

۱۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۔ ''میرے ابا جی''، مضمون نگار، ڈاکٹر وسیم صلاح الدین، ص ۲۷

اور آگے بڑھتے رہنے کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ایک اور مزاجی خصوصیت ان کی مہمان نوازی ہے، کو دعوتیں کرنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ صرف موسم کے اچھے ہونے کی بناء پر دعوت دے ڈالتے ہیں۔(۲) وہ گھر کے ملازموں، ڈرائیوروں، ماسی اور مالی تک سے ایسا برتاؤ رکھتے ہیں کہ۔۔۔ جب تک کہ ان کو یقین نہ ہو جائے کہ ڈرائیور نے کھانا کھالیا ہے، خود کھانا کھانے پر تیار نہیں ہوتے۔ ان کی اس درجہ محبت کا بعض لوگ ناجائز فائدہ بھی اٹھالیتے ہیں اور دھوکا دے جاتے ہیں لیکن وہ پھر بھی مطمئن رہتے ہیں۔(۳)

فرمان فتح پوری صاحب ایک اعلیٰ درجے کے اسکالر ہیں۔ ان کے مضامین اور ان کی کتابیں اس کا ثبوت ہیں۔ یہ مضامین اور کتابیں گنتی میں کم نہیں۔ لیکن گنتی (Quantity) کے ساتھ معیار (Quality) کے لحاظ سے بھی بلند درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا ایک ایک مقالہ اتنی محنت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی۔(۴)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ عاشق کتب Book Lover ہیں لیکن وہ حاسد عاشق کتب نہیں۔ وہ اپنے کتب خانے کی نادر کتابیں، جو آج کل نایاب اور کمیاب ہیں، افادۂ عام کے لئے نگار میں چھاپ دیتے ہیں۔(۵)

۱۔ ''میرے ابا جی''، مضمون نگار، ڈاکٹر وسیم صلاح الدین، ص ۷۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۷۲

۴۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت''، مضمون نگار، ڈاکٹر تنویر عباسی، ص ۳۰

۵۔ ایضاً

فرمان صاحب، نیاز کی شخصیت سے بے حد متاثر ہیں۔۔۔نیاز ان کے لئے وہی حیثیت رکھتے تھے جو''جاوید نامہ'' کے''زندہ رود'' کے لئے پیرروئیؒ کی تھی۔

فرمان صاحب نے اپنے ادبی مرشد پر علاوہ بیسیوں مضامین کے دو مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں:

۱۔ نیاز فتحپوری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شخصیت اور فن

۲۔ نیاز فتحپوری۔۔۔۔۔۔۔۔۔دید وشنید(۱)

فرمان صاحب کی تحریریں بتاتی ہیں کہ انہوں نے علامہ نیاز کو پہلی بار ۱۹۴۸ء میں دیکھا اور ان سے ملے۔۔۔یہ بالکل اتفاقی امر ہے کہ ۱۹۶۲ء میں فرمان فتحپوری ماہنامہ نگار کے حلقہ ادارت میں شامل ہو گئے اور ۱۹۶۳ء میں نگار کا''نیاز نمبر'' بھی نکال دیا۔(۲)

ڈاکٹر فرمان کو نیاز کے معنوی وارث ہونے کی صورت میں جو ایک قیمتی ورثہ ملا ہے، وہ ہے،''نگار'' جسے انہوں نے پرچے کی بعض روایات کے ساتھ اب تک زندہ رکھا ہے۔(۳) فرمان فتحپوری کے نام ہی سے''نیاز فتحپوری'' اور''نگار'' کی یاد آجاتی ہے۔(۴)

وفاداری بشرط استواری بھی فرمان صاحب کی خصوصیت ہے۔انہیں نیاز فتحپوری سے عقیدت بھی ہے اور محبت بھی۔(۵) ۱۹۲۲ء میں جاری ہونے والا نگار علامہ نیاز کے بعد آج تک جاری ہے اور اس کا کوئی شمارہ بے توجہی کی زد میں نہیں آیا، نہ صرف یہ بلکہ ڈاکٹر فرمان نے علامہ نیاز فتحپوری اور نگار کے نام کو ایک لمحے کے لئے بھی ادبی افق پر ماند نہیں

۱۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے) مضمون نگار: میرزا ادیب، ص ۲۴

۲۔ ''مولانا حسرت موہانی اور فرمان فتحپوری'' مضمون نگار، محمد حبیب صدیقی، ص ۱۲۱

۳۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے) مضمون نگار، میرزا ادیب، ص ۲۵

۴۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت'' مضمون نگار، ڈاکٹر تنویر عباسی، ص ۲۹

۵۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۲

پڑنے دیا۔(۱)

اس کے علاوہ نیاز صاحب کی یاد میں ہر سال جس اہتمام سے محفل آراستہ کرتے ہیں، وہ کوئی معمولی بات نہیں ۔۔۔اس محفل میں فرمان صاحب کا انہاک اور انکسار دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔(۲)

وہ ہر ماہ نگار کی پابندی سے اشاعت کے علاوہ ہر سال یادگاری خطبے کے عنوان سے علامہ نیاز فتحپوری کے نام اور کام کو ڈاکٹر فرمان منظر عام پر لاتے رہے ہیں ۔۔۔نیاز ونگار کا ہر مرحلہ ان کی وفاداری، سادگی اور اعتماد کا بہترین نمونہ ہے۔ دراصل ڈاکٹر فرمان مدیر نہیں، ادارہ ہیں۔ ذات نہیں انجمن ہیں اور خواہش نہیں، وفا ہیں جس پر قبولیت کے تمام در وا ہیں۔(۳)

فرمان فتحپوری مولانا حسرت موہانی سے بھی بہت متاثر ہیں۔ انہوں نے جس عقیدت اور تواتر کے ساتھ مولانا حسرت کا ذکر کیا ہے اور جتنا گہرا اثر مولانا حسرت کا قبول کیا ہے کہ شاید اتنا علامہ نیاز کا قبول نہیں کیا۔۔۔فرمان صاحب نے علامہ نیاز کو علم وادب کے وسیع مطالعے کے ذریعے جانا اور پہچانا ہے جب کہ مولانا حسرت کی عظمت کا عرفان، انہیں حسرت کی شخصیت اور علمی زندگی کے براہ راست مشاہدے سے میسر آیا ہے۔۔۔وہ محض مولانا حسرت کے ہم درس وہم عصر ہی نہیں بلکہ ان کے کردار وسیرت کے قائل بھی تھے اور مولانا کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب اس پس منظر میں دیکھیئے تو اندازہ ہوگا کہ علامہ نیاز کو بھی فرمان صاحب نے مولانا حسرت کے توسط سے پہچانا ہے اور علامہ سے جلد سے جلد قریب تر ہو جانے میں حسرت ونیاز کے باہم تعلق کو بھی دخل رہا ہے۔(۴)

۱۔ ''گیان کا درخت دعا کی چھاؤں'' مضمون نگار، امراؤ طارق، ص ۱۱۷

۲۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)'' مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۲

۳۔ ''گیان کا درخت دعا کی چھاؤں'' مضمون نگار، امراؤ طارق، ص ۱۱۸

۴۔ ''مولانا حسرت موہانی اور فرمان فتحپوری'' از، محمد حبیب صدیقی، ص ۱۲۰

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا حسرت موہانی کی وفات کے فوراً بعد ۱۷ مئی ۱۹۵۱ء کو فرمان صاحب نے ملیر کراچی میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا تھا، اس وقت فرمان صاحب کا قیام ملیر میں تھا۔۔۔۔تعزیت کے لئے منعقد کئے گئے اس جلسے میں مولانا کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کی قومی اور ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی رحلت پر اظہارِ تاسف کیا گیا۔۔۔ نیز مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ''بزمِ حسرت'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی گئی جس کا صدر حکیم سعید الرحمان صاحب رہبر کانپوری اور معتمد فرمان فتحپوری صاحب کو منتخب کیا گیا۔(۱)

مولانا حسرت موہانی سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی عقیدت کا اندازہ اس امر سے بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے نہ صرف ''بزمِ حسرت'' کی بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ بزم کے تحت ''حسرت'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالنے کا ڈیکلریشن حاصل کر کے ''حسرت نمبر'' شائع کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔(۲)

۱۹۷۶ء میں چار سو صفحات پر مشتمل نگار کا ضخیم حسرت نمبر نکالا۔(۳) نگار کا یہ ''حسرت نمبر'' حسرت کے سلسلے میں ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔اس میں حسرت کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم نشاط النساء کے بارے میں بھی مفصل مقالے موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا حسرت کی خودنوشت ''مشاہدہ زندان'' جو ایک مدت سے نایاب تھی، پوری کی پوری اس میں شائع ہوئی ہے۔۔۔۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا حسرت کی طرح مولانا کے ہم درس و ہم عصر اور نگار کے بانی علامہ نیاز کا انتقال بھی مئی کے مہینے میں ہوا۔ چنانچہ اسی رعائیت سے مئی یا جون میں فرمان صاحب دونوں کو ساتھ ساتھ یاد

۱۔ ''مولانا حسرت موہانی اور فرمان فتحپوری'' مضمون نگار، محمد حبیب صدیقی، ص ۱۲۲

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۵

کرتے ہیں اور پورا پرچہ ان کی نذر کرتے ہیں۔ان مہینوں میں فرمان صاحب کے لکھے ہوئے اداریئے ''ملاحظات'' اگرچہ مختصر نہیں لیکن مولانا حسرت سے فرمان صاحب کے جذباتی تعلق کا صاف پتہ دیتے ہیں۔(۱) مئی ۱۹۸۷ء کے ملاحظات کا آغاز مندرجہ ذیل سطروں سے ہوتا ہے:

''مئی کا مہینہ اردو زبان وادب کے دو بڑے ادیبوں کے سفرِ آخرت کا مہینہ ہے۔میری مراد مولانا حسرت اور علامہ نیاز سے ہے۔مجھے دونوں سے قرب و نیازمندی کا شرف حاصل رہا ہے۔
چنانچہ حسرت ہی کے الفاظ میں:

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

خاص طور پر مئی میں ان کی یاد بری طرح ستاتی ہے۔(۲)

حضرت سلطان جی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں خواجہ حسن سنجریؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا ''ہر کہ بود بحسن عمل بمقامے رسید'' فرمان صاحب بھی حسن عمل سے آج اس مقام تک پہنچے ہیں۔ان کی شخصیت، جدوجہد اور لگن کے کلیدی الفاظ بھی ''حسن عمل'' ہیں۔۔۔اسی حسن عمل نے انہیں زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر بنا دیا ہے۔(۳)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ان لوگوں میں سے ہیں جو ''فرد'' کی حیثیت سے آگے بڑھ کر ''انجمن'' یا ''ادارے'' کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔(۴)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایک ایسی شخصیت کے حامل ہیں جن پر ہر ادب کے عاشق کو

۱۔ ''مولانا حسرت موہانی اور فرمان فتحپوری'' از، محمد حبیب صدیقی، ص ۱۲۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۔ ''فرمان امروز (ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایک تاثر)''، مضمون نگار، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۴

۴۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت''، مضمون نگار، ڈاکٹر تنویر عباسی، ص ۲۹

رشک آنا چاہیئے اور وہ ایک ایسا روشن مینار ہیں جس سے آنے والی نسلوں کو روشنی ملتی رہے گی۔(۱)

آج وہ برصغیر ہی میں نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ متعدد وقیع کتابوں کے مصنف ہیں۔ پاکستان کی طرف سے دوردراز ممالک میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات میں حق نمائندگی ادا کر چکے ہیں۔ ان کا سفر افق تا افق جاری ہے اور اب بھی نئے بلند افق ان کے قدموں کے منتظر ہیں (۲) اور وہ یہ افق بھی طے کریں گے۔

انشاءاللہ

۱۔ ''قابل رشک ادبی شخصیت'' مضمون نگار، ڈاکٹر تنویر عباسی، ص ۳۱

۲۔ ''فرمان فتحپوری (چند جھلکیاں شخصیت اور فن کے حوالے سے) مضمون نگار، میرزا ادیب، ص ۱۷، مشمولہ: ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، ترتیب و تدوین، امراؤ طارق

تیسرا باب

پاکستان میں غالب شناسی کی روایت
(مئی ۱۹۵۲ء تک)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب سے متعلق پہلی مطبوعہ تحریر مئی ۱۹۵۲ء کی ہے، جہاں سے تحریری سطح پر اُن کی غالب شناسی کی ابتداء ہوئی۔۔۔اس باب میں قیامِ پاکستان کے بعد سے وسط ۱۹۵۲ء تک غالب شناسی کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔۔۔خیال ہے کہ اس عرصے میں ''غالبیات'' میں جو اضافے ہوئے، وہ فرمان فتحپوری کے پیشِ نظر رہے ہوں گے اور عجب نہیں کہ ان کے اثرات بھی انہوں نے کسی نہ کسی طور قبول کیئے ہوں!

سیّدہ افصح وحید

غالب شناسی کی روایت:

پوچھتے ہیں کہ وہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کیونکہ:

بلائے جان ہے، غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

غالب کی شخصیت اور کلام کے حیرت انگیز رموز و نکات کی بدولت ان کی انفرادیت اور اہمیت چند الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں صفحات لکھے جانے کے باوجود دل کی تشنگی کا یہ عالم ہے کہ غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی جستجو تا حال جاری ہے۔ البتہ جہاں تک مختصراً اس کی انفرادیت کو واضح کرنے کا سوال ہے تو اس کے لئے محض لفظ ''غالب'' ہی قابلِ اعتبار خیال کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ شعر و ادب کی دنیا پر ہر لحاظ سے غالب نظر آتے ہیں اور یہی غلبہ اور بادشاہت ''غالب شناسی کی روایت'' کو تقویت دیتا ہے۔

غالب شناسی کی روایت، میرؔ کی پیشین گوئی سے لے کر جب کہ غالب کی عمر ۱۲/۱۳ برس تھی (۱) آج تک جب کہ ان کی وفات کو ۱۳۳ برس گزر چکے ہیں، نت نئے زاویوں اور رنگوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب سے متعلق پہلی مطبوعہ تحریر مئی ۱۹۵۲ء کی ہے۔۔۔ اس باب میں قیامِ پاکستان کے بعد سے وسط ۱۹۵۲ء تک غالب شناسی کی روایت

۱۔ ''غالب کے اولین تعارف نگار'' مشمولہ: ''غالب، شاعر امروز و فردا'' از ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص ۳

کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

مذکورہ پانچ برسوں میں غالب شناسی کے مآخذوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً ایسی تحریریں جو مستقل کتابی صورت میں ہمارے سامنے آئیں۔ اس کے بعد وہ مقالات جو ان برسوں میں مختلف نقادوں نے قلم بند کئے اور وہ مختلف رسالوں اور مرتبات کی زینت بنے۔ تیسرے ان مجلوں کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد غالب شناسی کی روایت کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد غالب کے تعارف میں پہلی تصنیف ''نادرات غالب'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آئی۔ منشی نبی بخش حقیر اور ابنِ حقیر کے نام غالب کے نئے خطوں کا یہ مجموعہ میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاقؔ کو ورثے میں ملا اور انہوں نے سیر حاصل مقدمے اور قیمتی حواشی کے ساتھ اس کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام کیا۔ (۱) آفاق حسین آفاق کا یہ کام غالب شناسی کے حوالے سے لائق تحسین ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق ''نادراتِ غالب'' کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

> ''نادرات غالب، میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملیں گی۔ آفاق صاحب نے نہ صرف بہت سے ان غیر مطبوعہ نادر رقعات کو ضائع ہونے سے بچا لیا جو منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں بلکہ اپنی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے جن میں بہت سی کارآمد معلومات ہیں۔'' (۲)

''نادرات غالب'' کے بعد مولانا غلام رسول مہر نے ''خطوط غالب'' کے نام سے دو حصوں میں ایک مجموعہ مرتب کیا۔ حصہ اول ۱۹۵۱ء میں اور حصہ دوم فروری ۱۹۵۲ء

۱۔ ''غالب کا علمی سرمایہ'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ ص ۱۹۲

۲۔ ''سرنامہ'' ص ۴

کے بعد کتاب منزل لاہور سے شائع ہوا۔ ''خطوط غالب'' کے مرتب نے غالبؔ کو متعارف کروانے کے علاوہ مکتوب الیہم کے حالات کے حوالے سے مرزا غالب کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت کو بھی واضح کیا ہے۔(۱) ''خطوط غالب'' حصہ اول کے شروع میں دو صفحات کے ''تعارف'' کے علاوہ ۴۰ صفحات کا ''مقدمہ'' ہے جس کے اختتام پر ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ ''مقدمہ'' الگ ایک مقالے کی صورت میں بعنوان ''مقدمہ خطوط غالب'' (۱۹۵۱ء) ''تنقید غالب کے سو سال'' (۲) میں بھی شامل کیا گیا۔ اس مقدمہ میں غالبؔ کے خطوط کے اوصاف واضح کر کے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ان کی انفرادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

''اسلوب فکر و نگارش میں ابداع کی جو فراوانی غالب کے ہاں موجود ہے، اس کی مثالیں تو شاید ہی مل سکیں۔'' (۳)

غالب کے خطوط ایسے سدا بہار پھول ہیں جن کی خوشبو، رنگ و نور کو ہمیشہ تازہ رہنا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کا غالب سے متعلق یہ کام قیامِ پاکستان کے بعد غالبیات کے میدان میں ایک اہم پیش رفت ہے۔

۱۹۵۲ء میں ''انتخاب خطوط غالب'' کے عنوان سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور مشرف انصاری کی مرتب کردہ کتاب سامنے آئی۔ اس کتاب کی مدد سے غالب کو بحیثیت نثر نگار ایک خاص حوالے سے متعارف کروایا گیا ہے۔ اس کتاب میں ''اردوئے معلیٰ'' (۴) ''عود ہندی'' (۵) اور ''نادرات غالب'' (۶) میں شامل خطوط میں سے

۱۔ ''خطوط غالب''، تعارف، ص ۶

۲۔ ''تنقید غالب کے سو سال'' ۱۹۶۹ء، مرتب سید فیاض محمود، ص ۲۹۰ تا ۳۲۲

۳۔ ''مقدمہ'' خطوط غالب، ص ۳۸

۴۔ دہلی، ۱۸۶۹ء ۵۔ میرٹھ، ۱۸۶۸ء ۶۔ کراچی، ۱۹۴۹ء

جو خط اسلوب و انشاء کے اعتبار سے پروفیسر مشرف انصاری کو اچھے لگے، ان کا انتخاب کیا گیا اور یہ امید کی گئی کہ پڑھنے والے ان خطوط کے مطالعے سے انشاء کا لطف پائیں گے۔

غالب کو متعارف کروانے میں جہاں مختلف ادیبوں کی تنہا کاوشوں کے نتیجے میں غالب کے متعدد جواہر کتابی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں، وہاں متعدد نقادوں نے غالب پر مختلف مضامین لکھ کر اپنے اپنے حوالے سے غالب کے مختلف پہلوؤں کو روشناس کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے ضمن میں غلام رسول مہر نے مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک قابل قدر مضمون بعنوان ''غالب کی خاندانی پنشن'' تحریر کیا۔ یہ مضمون پہلے ''علی گڑھ میگزین'' (۱) اور پھر ''احوال غالب'' (۲) میں شائع ہوا۔

غلام رسول مہر نے غالب کے خاندانی حالات اور پینشن سے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کردہ (۳) ہر نکتے کی دلائل سے وضاحت کی ہے اور فرحت اللہ بیگ کی مذکورہ حوالے سے فراہم کردہ معلومات کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ (۴)

حمید احمد خان نے مارچ ۱۹۴۹ء میں ''امراؤ بیگم'' کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جو ''علی گڑھ میگزین'' کے غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ حمید احمد خان نے اپنے اس مضمون میں غالب اور ان کی شریک حیات ''امراؤ بیگم'' کے درون خانہ حالات پر مختلف حوالوں سے تبصرہ کر کے غالب کے عادات و اطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں ایک

۱۔ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۱۷۔۲۸

۲۔ ''احوال غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد، ص ۱۲۵۔۱۳۸

۳۔ ''مرزا فرحت اللہ بیگ'' نے خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان کے متعلق ایک مضمون لکھا جو اپریل ۱۹۳۱ء کے رسالہ ''اردو'' میں شائع ہوا۔ اس میں غالب کے خاندانی حالات اور پینشن کے متعلق نئی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔

۴۔ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۲۸

حوالہ بگا بیگم کا ہے جن سے حمید احمد خان نے خود جولائی ۱۹۳۸ء میں ملاقات کی۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کی ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ حمید احمد خان نے امراؤ بیگم کے مختصر حالات زندگی اور محرومیوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی پرہیز گاری اور شائستگی کا بطور خاص ذکر کیا ہے جب کہ غالب آزاد منش تھے۔ ان تضادات اور اختلاف مزاج کے باوجود حمید احمد خان نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کی صورت کو نہ پہنچے کیونکہ:

> ''مرزا غالب اور امراؤ بیگم دونوں پرانے شرفا کی وضعداری کا نمونہ تھے اور طبیعتوں کے شدید اختلاف ہوتے ہوئے بھی آخر عمر تک ایک دوسرے سے نباہ کرتے چلے گئے۔'' (۱)

یہاں تک کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب اس جہان سے رخصت ہوئے اور ان کی پہلی برسی (۱۵ فروری ۱۸۷۰ء) کے دن امراؤ بیگم بھی شوہر کے پیچھے روانہ ہوئیں۔

عبدالمجید سالک نے ''رسالہ، لطائف غیبی اور مرزا غالب'' کے عنوان سے مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک مقالہ لکھ کر غالب کو متعارف کروایا ہے۔ غالب نے محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی مشہور کتاب ''برہان قاطع'' (۲) کی اغلاط کو واضح کر دینے کی غرض سے ''قاطع برہان'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو ۱۸۶۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کی مخالفت میں جو کتابیں آئیں، ان میں سے ایک مولوی سعادت علی کی ''محرق قاطع'' کے نام سے ہے۔ اس کتاب کے جواب میں میاں داد خان سیاح نے ''لطائف غیبی'' کے نام سے ایک رسالہ ۱۸۶۴ء میں شائع کیا۔ جس میں غالب اور منشی سعادت علی کا تقابلی جائزہ لے کر غالب کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا گیا ہے اور غالب پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی گئی ہے۔ عبدالمجید سالک کے خیال میں لطائف غیبی:

۱۔ ''علی گڑھ میگزین'' غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء، ص ۸۴

۲۔ ۱۶۵۱ء

''مرزا نے خود لکھ کر میاں داد سیاح کے نام سے شائع کرائی ہوگی یا اس کی اصلاح و ترمیم میں مرزا کا اس قدر دخل ہے کہ عبارتوں کی عبارتیں ان کی اپنی لکھی ہوئی ہیں۔'' (۱)

اپنے اس نقطۂ نظر کی توجیہہ عبدالمجید سالک، مرزا کی خودداری میں تلاش کرتے ہیں کہ غالب خود منشی سعادت علی کے مقابلے پر آنا کسر شان خیال کرتے تھے۔ (۲)

غالب اور کلام غالب کے حوالے سے پروفیسر حمید احمد خان کا مقالہ ''غالب کی شاعری میں حسن و عشق'' بھی منفرد مقام کا حامل ہے۔ یہ مقالہ اوّل اوّل فروری ۱۹۴۹ء کے ''ہمایوں'' (لاہور) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ۹۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو نظر ثانی کے بعد ''نقد غالب'' (۳) اور پھر ''تنقید غالب کے سو سال'' (۴) میں شامل کیا گیا۔ حمید احمد خان نے اس مقالے میں غالب کے اردو و فارسی کلام میں حسن و عشق سے متعلق اشعار کی نوعیت کو واضح کیا ہے اور انہیں تنوع، جدت پسندی اور نکتہ آفرینی کا حامل قرار دے کر ان ناقدین کی آراء کو ردّ کیا ہے جو حسن و عشق کے باب میں غالب کے یہاں تعمق و تنوع کے قائل نہیں۔ (۵) غالب کے حسن و عشق سے متعلق اشعار کی اہمیت کے پیش نظر حمید احمد خان ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ

۱۔ ''علی گڑھ میگزین'' غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۱۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۔ ''نقد غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد، ص ۹۰ تا ۱۳۲

۴۔ ''تنقید غالب کے سو سال'' مرتبہ سید فیاض محمود، اقبال حسین، ص ۲۳۲ تا ۲۷۶

۵۔ ''پروفیسر حمید احمد خان اور مرزا غالب'' مضمون نگار، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، مشمولہ ''افکار'' حمید احمد خان ایڈیشن ۱۹۷۰ء، ص ۶۶

طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔"(۱)

غالب شناسی کی روایت میں مولانا غلام رسول مہر کا ایک مقالہ بعنوان "مرزا غالب کا مقدمہ" بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مقالہ "علی گڑھ میگزین" کے غالب نمبر، ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ غلام رسول مہر نے اپنے مقالے میں غالب کی زندگی سے متعلق ایک اہم مقدمے کی روداد کو پیش کیا ہے۔ محمد حسین نے فارسی لغت "برہان قاطع" کے نام سے ۱۶۵۱ء میں مرتب کی۔ ۱۸۵۷ء کے زمانے سے جب مرزا خانہ نشین ہو گئے تھے تو انہوں نے "انقلاب ستاون" کے حالات فارسی زبان میں لکھنے کے علاوہ "برہان قاطع" کے سقم کو کتاب کے حاشیہ پر رقم کر دیا اور بعد ازاں اسے ۱۸۶۲ء میں منشی نولکشور کے مطبع نے "قاطع برہان" کے نام سے شائع کیا۔ اس کی اشاعت سے مخالف و موافق کتابوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جب مرزا غالب نے مولوی احمد علی (۲) کو مخاطب کرتے ہوئے شوخی و ظرافت سے کام لیا تو مولوی امین الدین پٹیالوی نے "قاطع القاطع" کے عنوان سے ایک کتاب ۲۶۸ صفحات پر مشتمل لکھی جس میں وہ علمی متانت اور شائستگی کے معیار سے گر گئے۔ چنانچہ مرزا غالب نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو مولوی امین الدین کے خلاف ازالۂ حیثیت کا مقدمہ درج کر دیا جو ۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی نامہ پر ختم ہوا۔ مولانا مہر کے مذکورہ مقالے میں اس مقدمے کی تفصیل بیان کر کے غالب کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غلام رسول مہر نے اپنے مقالے میں "برہان قاطع"، "قاطع برہان" اور "قاطع القاطع" کو قابل اعتراض عبارتوں کو بالمقابل تحریر کر کے ان الفاظ و فقرات کو واضح کیا ہے جو باعث ازالۂ حیثیت قرار پائے۔(۳)

۱۔ "نقد غالب" مرتبہ مختار الدین احمد، ص ۹۰

۲۔ "مویّد برہان" مولف مولوی احمد علی۔ یہ کتاب "قاطع برہان" کی مخالفت میں لکھی گئی۔

۳۔ "غالب کا مقدمہ" مشمولہ "علی گڑھ میگزین" غالب نمبر، ۴۹۔۱۹۴۸، ص ۳۸

مئی ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''غالب کی عشقیہ شاعری'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین (۴۹۔۱۹۴۸) کے غالب نمبر میں شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء میں ممتاز حسین نے ''غالب کا نظریہ شعر'' کے زیرِ عنوان اپنے مضمون میں غالب کے نظریہ فن کو واضح کیا ہے۔ یہ مقالہ ''نقد غالب'' (مرتبہ مختار الدین احمد) میں شامل ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی بحث میں یہ بتایا ہے کہ غالب نے شاعری کبھی بھی چھوٹے محرکات کی بناء پر نہ کی اور وہ شاعری کو ترسیل علم کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایک ایسے علم کا جو اس کے خون میں تحلیل ہوتا ہے۔ (۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالے ''غالب، معتقدِ میر'' میں غالبؔ کو میرؔ کے عقیدت مند کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔ یہ مقالہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو نظر ثانی کے بعد ''نقد غالب'' میں شامل کیا گیا۔ میرؔ کی عظمت کے معترف غالب کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے غالبؔ پر میرؔ کے اثرات کو دریافت کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''غالبؔ، میرؔ کے محض رسمی معتقد نہ تھے بلکہ انہیں اپنے ذہنی ارتقاء کے سفر میں فیض و ہدایت کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔'' (۲)

اپریل ۱۹۵۲ء میں حمید احمد خان نے اپنے مضمون بعنوان ''غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک'' پر نظر ثانی کی جسے ''احوال غالب'' (۳) کی زینت بنایا گیا، اپنے مقالے میں حمید احمد خان نے غالب کے ''دیوان خانے'' کی زندگی اور اس کے ساتھ ''حرم سرا'' میں زندگی کا نقشہ بیان کیا ہے۔ ان تمام حالات اور واقعات کا ''بگا بیگم'' (۴) کی

۱۔ ''نقد غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد، ص ۲۲۳

۲۔ ''غالب ۔۔ معتقد میر'' مشمولہ ''نقد غالب'' ص ۸۸

۳۔ ''احوال غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد، ۱۹۵۳ء، ص ۸۷ ت ۸۷

۴۔ نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم، نواب ضیاء الدین خان نیر رخشان کی بیٹی اور غالب کے منہ بولے بیٹے عارف کے بڑے لڑکے باقر علی خان کی بیوی تھیں۔ احوال غالب، ص ۸۳

زبانی قلم بند کیا گیا جس سے ملاقات کا شرف حمید احمد خان کو اپنے دوست حکیم محمد کامل خان صاحب دہلوی کی معرفت جولائی ۱۹۳۸ء میں حاصل ہوا۔(۱)

مئی ۱۹۵۲ء میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے مضمون ''غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر'' کے تحت غالب کی شخصیت اور کلام کی چند خصوصیات کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کا یہ مضمون ''نقد غالب'' کا حصہ ہے۔(۲)

ڈاکٹر وحید قریشی نے مئی ۱۹۵۲ء میں ایک مقالے بعنوان ''غالب کا نظریہ شعر'' لکھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ مضمون ''نقد غالب'' مرتبہ مختارالدین احمد (۱۹۵۶، ۱۹۹۵) میں شامل ہے۔ اس مقالے میں غالب کی انفرادیت اس طور پر بیان کی گئی ہے کہ غالب کی شخصیت نے قدیم ادوار کے نمائندوں (بیدل، صائب، محوی، ظہوری، عرفی اور حافظ) کے کلام سے استفادہ ضرور کیا لیکن ان کی روشنی میں اپنا ایک الگ راستہ متعین کیا۔(۳) بالفاظ دیگر ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں غالب نے پرانے نسخوں کو نئے ڈھنگ سے استعمال کیا۔(۴)

غالب شناسی کے حوالے سے ایک نام ڈاکٹر آفتاب احمد کا ہے جو اس روایت کو تا حال جاری رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں غالب پر ان کی کتاب ''غالب آشفتہ نوا'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔ مذکورہ دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء) میں ڈاکٹر آفتاب احمد نے ''اردو شاعری میں غالب کی اہمیت'' کے زیر عنوان جون ۱۹۵۲ء میں غالب پر مقالہ لکھ کر شعر و سخن میں ان کی انفرادیت کو متعین کیا ہے۔ یہ مقالہ مختارالدین احمد کی مرتب کردہ ''نقد غالب'' (۱۹۵۶ء، ۱۹۹۵)۔(۵) کا حصہ ہے۔

۱۔ ''احوال غالب'' ص ۸۲،

۲۔ ''نقد غالب''، ص ۲۴۷ تا ۲۸۰

۳۔ ''نقد غالب'' مرتبہ مختارالدین احمد آرزو، ص ۲۰۴

۴۔ ''نقد غالب'' مرتبہ مختارالدین احمد آرزو، ص ۲۰۵ (۵) ایضاً، ص ۳۵۳ تا ۳۶۴

ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنے ایک مضمون میں غالب کو نہ صرف ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ زندہ شاعر بلکہ ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کے خالق کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

''دیوان ناظم میں غالب کا حصہ'' کے تحت شیخ محمد اکرام نے جون ۱۹۵۲ء میں غالب کی اہمیت اور فن شاعری میں انفرادیت کو ایک منفرد حوالے سے بیان کیا ہے۔ مذکورہ مضمون میں شیخ محمد اکرام نے ''دیوان ناظم'' اور ''دیوان غالب'' کے اشعار کا تقابلی مطالعہ کر کے ان دونوں دواوین کے لفظی و معنوی اشتراک اور فارسی تراکیب میں ہم آہنگی کو نمایاں کیا ہے۔ بلکہ شیخ محمد اکرام کے خیال میں مضامین کے اعتبار سے بھی دیوان ناظم کے کئی اشعار غالب کے خیالات کا عکس ہیں۔(۱) کیونکہ نواب یوسف علی خان، والی رام پور نے فن شعر میں غالبؔ کی شاگردی کے ساڑھے چار برسوں بعد ہی نومبر ۱۸۶۱ء میں پونے تین سو صفحات پر مشتمل ادبی نوعیت کا حامل دیوان تخلیق کر لیا جس بناء پر یہ روایت عام ہوئی کہ ''دیوان ناظم'' کی تصنیف میں شاگرد سے زیادہ استاد (مرزا غالبؔ) کا ہاتھ ہے۔ شیخ محمد اکرام نے ''دیوان ناظم'' اور ''دیوان غالب'' کی مماثلت کو اشعار کے حوالے سے نمایاں کیا ہے۔(۲)

مستقل تصانیف، ادبی مقالات و مرتبات سے قطع نظر مختلف ادبی رسالوں نے بھی غالب شناسی کی روایت کو تقویت دینے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ان رسالوں میں ایک نام ''ماہ نو'' کا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد غالب کے تعارف میں ''ماہ نو'' نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ سید وقار عظیم کی ادارت میں اس مجلے نے قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بطور خاص اردو کے عظیم المرتبت شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی حیات و کلام کے بعض اہم

۱۔ ''نقد غالب''، ص ۳۱۲

۲۔ ''نقد غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد، ص ۳۱۷

پہلوؤں سے بحث کی ہے اور اس حوالے سے بالخصوص پاکستان میں غالب شناسی کی روایت کا آغاز کیا۔

''ماہ نو'' کے فروری کے شمارے میں بالعموم ہر برس مرزا غالب کی برسی کی مناسبت سے غالب کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔سید وقار عظیم ''ماہ نو'' کے فروری ۱۹۵۰ء کے شمارے کے تعارف میں ''کچھ اپنی باتیں'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں.

> ''فروری میں مرزا غالب کی برسی منائی جاتی ہے۔ماہ نو نے اپنی گذشتہ روایت کے سلسلہ میں اس مرتبہ بھی یہ کوشش کی ہے کہ غالب کی زندگی اور کلام کے کچھ نئے پہلو قارئین کے سامنے پیش کئے جائیں۔''(۱)

''ماہ نو'' نے غالب سے متعلق ایسے مضامین بھی شائع کئے ہیں جو نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں سرسید کا مضمون ''اسد اللہ خان غالب'' (۲) اور مولوی احتشام الدین دہلوی مرحوم کے مضمون ''غالب کے بعض غیر مطبوعہ لطیفے اور شعر'' (۳) کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔نثار احمد فاروقی ''ماہ نو'' اور غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہر سال ماہ فروری میں غالبؔ کی یاد منائی جاتی ہے۔رسالہ ''آج کل'' (دہلی) اور ''ماہ نو'' (کراچی) تو بالالتزام کچھ نہ کچھ ہر سال غالب سے متعلق شائع کرتے ہی ہیں۔''(۴)

اسلامیہ کالج (لاہور) کے مجلّے ''کریسنٹ'' کے فروری، اپریل ۱۹۵۱ء کے

۱۔ ''کچھ اپنی باتیں'' ماہ نو، فروری ۱۹۵۰، ص ۶

۲۔ ''ماہ نو''، فروری، ۱۹۵۰ء، ص ۸ تا ۱۲

۳۔ ''ایضاً'' ص ۲۲، ۲۳

۴۔ ''تلاش غالب'' از نثار احمد فاروقی، لاہور، مئی ۱۹۶۹ء ص ۱۲۳

شمارے میں ''غالب اور اقبال کے ملتے جلتے اشعار پر تبصرہ'' کے زیر عنوان ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر کا مضمون شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے غالب اور اقبال کی فکری سطح پر ہم آہنگی کو اجاگر کیا ہے۔اس سے ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کا مطمحِ نظر غالب کے اثرات کو تلاش کر کے انہیں کلاسیک کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

مندرجہ بالا تمام بحث میں قیام پاکستان کے ابتدائی پانچ برسوں میں غالب شناسی کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا غالب سے متعلق پہلا مضمون مئی ۱۹۵۲ء کے ''نگار'' میں شائع ہوا جہاں سے تحریری سطح پر ان کی غالب شناسی کی ابتدا ہوئی۔خیال ہے کہ غالب سے متعلق مندرجہ بالا تمام تصانیف، رسالے اور مضامین ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے پیش نظر رہے ہوں گے جن کے اثرات بھی انہوں نے کسی نہ کسی طور قبول کیے ہوں گے۔

چوتھا باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اہم کتاب:

''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' کا تجزیاتی مطالعہ (۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مضامین کے مجموعے ''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا، جانچا اور پرکھا گیا ہے۔۔۔ یہ منصب، جس سلیقے اور انداز سے ادا کیا گیا ہے، اس میں ہر جگہ، تازگی و شگفتگی ہے۔۔۔ یہ سب مضامین بقول مصنف، غالب کی ہشت پہلو ذات، جامع الصفات شخصیت، صد رنگ فن اور ہزار شیوہ ادیب کی وکالت اور وضاحت کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔۔۔ اور تحقیق نے، منطق کی خوش استدلالی اور تنقید نے فلسفے کی خوش فکری کی مدد سے محقق اور نقاد کی راہ کو آسان بنایا ہے۔

پروفیسر سید وقار عظیم

تجزیاتی مطالعہ (۱)

اقبال نے ''اسرار خودی'' میں اپنے متعلق یہ کہا کہ:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد

لیکن جہاں تک غالب کا تعلق ہے تو وہ بھی ان شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی قدر و منزلت کا اندازہ اور عظمت کا تعین بعد از مرگ کیا گیا اور انہیں بلندیوں کے اس مقام پر پایا گیا جو قابل رشک بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔

ہر نقاد اور غالب شناس نے اپنی بساط اور اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے غالب کی نظم و نثر کا تجزیہ کر کے ادبی دنیا میں ان کا مقام متعین کیا ہے اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری بھی اسی کارواں کے ایک مسافر ہیں۔

غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا پہلا مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع پر ہے۔ یہ مقالہ پہلی مرتبہ رسالہ ''نگار'' لکھنؤ شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور یہیں سے نہ صرف ان کی تنقید بلکہ غالب شناسی کی باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ تحریری طور پر غالب سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ورنہ انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''مجھے آٹھویں جماعت سے غالب کا پورا دیوان یاد تھا۔'' (۱)

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ممتاز محقق، نقاد اور دانشور از پروفیسر حسن وقار گل، ص ۳۴۶ (مشمولہ: ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات) حصہ سوم، ترتیب و تدوین: امراؤ طارق)

غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی پہلی کتاب ''غالب شاعرِ امروز وفردا'' کے نام سے پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ناشر اظہار سنز، لاہور ہیں۔ اب تک کتاب کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے اس کا مقدمہ ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مقدمے کا کچھ حصہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ''ماہ نو'' کراچی، فروری ۱۹۷۰ء میں ''غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ (۱) یہ کتاب ۳۲۷ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ۱۵ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین زمانی ترتیب سے نہیں بلکہ موضوعاتی مناسبت سے ہیں جن میں غالب کی نظم ونثر دونوں کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے اس میں شامل بعض مضامین تحقیقی ہیں، بعض تنقیدی اور کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جو بیک وقت دونوں خصوصیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

تحقیقی مضامین

۱۔ غالب کے اولین تعارف نگار (ص ۱۔۔۳۴)

۲۔ غالب اور غالب تخلص کے اردو شعراء (ص ۳۵۔۔۷۴)

۳۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز (ص ۳۰۳۔۔۳۱۰)

۴۔ غالب کے حالات میں پہلا مضمون (ص ۳۱۱۔۔۳۱۸)

تنقیدی مضامین

۱۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ (ص ۷۵۔۔۹۰)

۲۔ غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو (ص ۱۴۹۔۔۱۷۰)

۳۔ ''مکمل شرح دیوان غالب'' پر ایک نظر (ص ۱۷۱۔۔۱۸۶)

۴۔ غالب کے کلام میں استفہام (ص ۱۸۷۔۔۲۰۴)

۵۔ غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم (ص ۲۶۵۔۔۲۸۴)

۱۔ ''ماہ نو'' کراچی، فروری ۱۹۷۰ء، ص ۲۱۔۲۳

۶۔ غالب کے مقطعے (ص ۲۸۵۔۔۳۰۲)

۷۔ اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے! (ص ۳۱۹۔۔۳۲۷)

<u>ملے جلے تحقیقی وتنقیدی مضامین</u>

۱۔ غالب اور اقبال (۱) (ص ۹۱۔۔۱۲۶)

۲۔ غالب اور اقبال (۲) (ص ۱۲۷۔۔۱۴۸)

۳۔ غالب ''نسخۂ حمیدیہ'' کی روشنی میں (ص ۲۰۵۔۔۲۴۰)

۴۔ غالب۔ شاعر امروز وفردا (ص ۲۴۱۔۔۲۶۴)

ڈاکٹر فرمان کی اس کتاب میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو اس کتاب کی اشاعت سے کئی برس پہلے قلم بند کئے گئے اور جنہیں ان کی ابتدائی نگارشات کہا جا سکتا ہے۔ان میں ان کا پہلا مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام'' (۱۹۵۲ء)، ''مکمل شرح دیوان غالب'' پر ایک نظر (۱۹۵۴ء)، ''غالب واقبال'' (۱۹۵۵ء) اور ''غالب کے مقطعے (۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔اس کے علاوہ ایسے مضامین بھی ہیں جو کتاب کی اشاعت سے ایک دو سال پہلے کے ہیں۔مضامین کی اہمیت کو خود ڈاکٹر فرمان اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ان میں سے بعض خال و خط ایسے ہو سکتے ہیں جنہیں پہلے بھی محسوس کیا گیا ہوگا یا جو اس سے پہلے بھی قارئین غالب کی نظر سے گزر چکے ہوں گے لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جو نئے پن اور تازگی کا احساس دلائیں گے۔اس کتاب میں غالب کی زندگی اور فن کے بارے میں بعض نئی معلومات، نئے تجربے اور نئی تاویلیں بھی ملیں گی، مجھے یقین کامل ہے کہ ان سے غالب کو نئے زاویے یا کم از کم میرے زاویے سے دیکھنے یا دکھانے میں مدد ملے گی۔''(۱)

۱۔ (مقدمہ) ''کتاب سے پہلے'' ص، ط

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ٹھیک کہا ہے کہ:

''غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ان کے کم و بیش ایک چوتھائی صدی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔'' (۱)

اور اسی بناء پر ڈاکٹر معین الرحمٰن اس کتاب کی حیات جاوداں کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ کتاب غالب کے ضمن میں گراں قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں بعض عنوانات ایسے اچھوتے ہیں جن پر باعتبار موضوع پہلی مرتبہ قلم اٹھایا گیا اور غالب کو ایک نئے رخ سے سمجھنے میں یہ عنوانات سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب، شاعر امروز و فردا'' میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی محققانہ کاوشوں سے کلام غالب اور اس سے وابستہ بعض اہم جزیات کے بارے میں گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے غالب کی شاعری اور اس کی فکر کے بعض اہم پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔'' (۲)

اس کتاب کی تخلیق کی غرض و غایت اور غالب سے اپنی عقیدت کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ کتاب دراصل غالب کی اسی رفاقت و دمسازی کا اعتراف اور ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان کی روح کے حضور ایک ادنیٰ سا سپاسنامہ ہے۔'' (۳)

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی''، تحقیق نامہ، شمارہ ۳۔۴، ص ۱۰۴

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''مقالہ نگار، ڈاکٹر سلیم اختر، مشمولہ ماہنامہ ''محفل'' لاہور، جنوری ۱۹۷۹ء، ص ۴۴

۳۔ ''کتاب سے پہلے'' (مقدمہ) ص چ

اس کتاب میں شامل مضامین کا الگ الگ تجزیاتی مطالعہ کر کے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی بصیرت اور ان کی غالب شناسی کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱)

''غالب کے اولین تعارف نگار'' ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تصنیف ''غالب شاعر امروز و فردا'' کا پہلا مضمون ہے۔ یہ مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے۔ کتاب میں شامل ہونے سے پہلے یہ مضمون ''سہ ماہی اردو'' کراچی کے شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء (بیاد غالب) میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے بارے میں اولین تاثرات یا مضامین قلم بند کرنے والوں کا سراغ لگایا ہے اور حوالوں اور دلائل سے اپنی رائے اور خیالات کو قابل اعتبار بنایا ہے۔ سب سے پہلے ان کی مدت عمر کا تعین عیسوی اور ہجری کی مناسبت سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ غالب ۱۲۱۲ھ بمطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ذی القعد ۱۲۸۵ھ بمطابق فروری ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اس طرح یہ تعین کیا گیا کہ سن ہجری کے لحاظ سے غالب نے تہتر (۷۳) سال اور سن عیسوی کے اعتبار سے بہتر (۷۲) سال کی عمر پائی۔ غالب کی زندگی میں ہی ان پر اور ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ پھر غالب کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ء تک ان پر بے شمار جواہر پارے سامنے آئے جن میں ہر زاویے اور نقطۂ نظر سے اس عظیم شاعر کی عظمت اور مرتبے کی بلندی کا تعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس مضمون میں اس مروجہ خیال کی دلائل سے تردید کی ہے کہ غالب کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خان کی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' مرقومہ ۱۸۴۶ء میں ملتا ہے۔ ان کے خیال میں ''آثار الصنادید'' سے پہلے کئی تذکرہ نگار غالب کا تعارف کرا چکے تھے۔ پھر ڈاکٹر فرمان فتحپوری غالب کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کے متعلق اولین تعارف کی حیثیت سے میر تقی میر کی پیش گوئی کا حوالہ دیتے ہیں۔ مولانا حالی نے کہا ہے کہ میر نے مرزا غالب کے اشعار سننے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے

پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''(۱)

غلام رسول مہر نے اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری، مالک رام کے حوالے سے اس بات کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں کہ غالب کی عظمت اور مرتبے کو متعین کرنے میں میرؔ کے ان کلمات کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور نہ صرف تین معتبر حوالوں سے جن میں مولانا حالیؔ (۲)، مالک رام (۳) اور امتیاز علی عرشی (۴) کا حوالہ شامل ہے، یہ ثابت کیا کہ غالب نے بہت کم عمری میں شاعری شروع کر دی تھی اور ان کے کلام نے بہت جلد رتبۂ اعتبار بھی حاصل کر لیا تھا۔

میرؔ کے سن وفات ۱۲۲۵ھ اور غالبؔ کے سن پیدائش ۱۲۱۲ھ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس وقت غالب کے اشعار میرؔ تک پہنچے، اس وقت غالب کی عمر ۱۲/۱۳ برس تھی اور اتنی عمر میں غالب کے اشعار کا میر تقی میر تک پہنچنا اور پھر ان کے بارے میں میرؔ کا اظہار خیال بعد از قیاس نہیں رہ جاتا۔

غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کی نثری تقریظ کو ''آثار الصنادید'' سے پہلے کی پیر ر ردیا ہے۔ اس نثری تقریظ میں نواب ضیاء الدین احمد خان نے غالب کو سرخیل انجمن نکتہ دانان قرار دیتے ہوئے ان کی توصیف میں چند اشعار بھی کہے ہیں جو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق غالب کے کلام پر ولین تنقیدی خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار کو ڈاکٹر فرمان نے اس مضمون میں شامل کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ''آثار الصنادید'' میں شائع ہونے کے باوجود یہ نثری تقریظ اس سے بہت پہلے کی ہے اور یہ اردو دیوان ۱۸۴۱ء مطبوعہ سید الاخبار، دہلی میں بھی

۱۔ ''یادگار غالب'' مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۸

۲۔ ''یادگار غالب''

۳۔ ''ذکر غالب'' اور ''دیوان غالب کا دیباچہ''

۴۔ ''دیوان غالب'' اردو نسخہ عرشی (۱۹۵۸ء)

شامل تھی لیکن حقیقتاً یہ تقریظ اس سے تین سال پہلے دیوان اردو کے قلمی مسودہ کے لئے لکھی گئی تھی اور مولانا امتیاز علی عرشی نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی ہے۔(۱) لیکن نواب ضیاء الدین احمد خان کی یہ نثری تقریظ بھی تعارف غالب کے سلسلے کی پہلی تحریر نہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس سے پہلے لکھے جانے والے تذکروں کا ذکر کیا ہے،جن میں:

۱۔ عیارالشعرا مؤلفہ خوب چند ذکا
۲۔ عمدہ منتخبہ مؤلفہ اعظم الدولہ سرور
۳۔ گلشن بے خار مؤلفہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔''دیباچہ گلشن بے خار'' سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ جون ۱۸۳۲ء میں شروع ہوا اور اپریل ۱۸۳۵ء میں ختم ہوا۔اس لحاظ سے یہ سرسید احمد خان کی ''آثار الصنادید'' سے پورے گیارہ برس پہلے لکھا گیا۔غالب کے حوالے سے اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

> ''گلشن بے خار،غالب کے سلسلے میں یوں اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ غالب نے اپنے اردو کلام کا بہت سا حصہ حذف کر کے موجود دیوان مرتب کیا تھا گویا نسخہ حمیدیہ کا سراغ سب سے پہلے شیفتہ نے دیا ہے۔بعد کے تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے،انہیں کے حوالے سے لکھا ہے۔(۲)

عمدہ منتخبہ اور عیار الشعرا میں بھی غالب کا ذکر صراحت سے آیا ہے اور یہ دونوں تذکرے گلشن بے خار سے پہلے لکھے گئے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی تحقیقی بصیرت سے کام لیتے ہوئے ان تذکروں کے زمانۂ تحریر کو مختلف حوالوں سے متعین کیا ہے اور ان دونوں

۱۔ ''دیباچہ دیوان اردو نسخہ عرشی''(۱۹۵۸ء)
۲۔ ''غالب کے اولین تعارف نگار''مشمولہ''غالب شاعر امروز و فردا''ص،۱۱

تذکروں کی اہمیت کے بارے میں بتایا ہے کہ:

''یہ دونوں تذکرے غالب کے سلسلے میں خاصے اہم ہیں۔ان کے ذریعے غالب کے بعض ایسے نایاب اشعار سامنے آتے ہیں جو نسخہ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان دونوں تذکروں میں شامل غالب کے اشعار کو علیحدہ علیحدہ نقل کر کے یہ بتایا ہے کہ ان میں سے کون کون سے اشعار نسخہ عرشی، نسخہ مالک رام میں شامل ہیں اور کونسے ایسے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں اور ان کا واحد مآخذ اب تک یہی تذکرے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بڑی باریک بینی سے اور دلائل سے ہر نکتہ کی وضاحت کی ہے جو ان کی غالب شناسی کا عمدہ ثبوت فراہم کرتی ہے۔

کئی دوسرے تذکروں میں بھی غالب کا ذکر ''آثار الصنادید'' سے پہلے آچکا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ایک تذکرے ''گلدستہ نازنیناں'' کا ذکر کیا ہے۔یہ تذکرہ کریم الدین صاحب کا ہے اور اس کے دیباچہ میں خود کریم الدین نے کہا ہے کہ یہ ۱۸۴۴ء میں مکمل ہوا ہے۔یہ بھی غالب کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ڈاکٹر فرمان کے خیال میں گلدستہ نازنیناں کے ساتھ قطب الدین باطن کے تذکرے ''گلستاں بے خزاں'' کا ذکر بھی ضروری ہے، اس کا تاریخی نام ''عندلیب'' ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۶۴ھ نکلتا ہے اور یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا۔اس کے دیباچہ میں باطن نے لکھا ہے کہ یہ دراصل گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا۔شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں باطن کے استاد نظیر اکبرآبادی کے متعلق لکھ دیا تھا۔

''ان کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں۔ان اشعار کی بناء پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔''(۲)

۱۔ ''غالب کے اولین تعارف نگار'' مشمولہ ''غالب شاعرِ امروز و فردا، ص ۱۴

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۲۷

چنانچہ باطن نے اپنے تذکرے میں اس کا انتقام لیا اور شیفتہ کے استاد اور ممدوحین کو جی کھول کر برا بھلا کہا۔ غالب بھی قدرتاً ان کے طعن و تعریض کا نشانہ بنے۔ ڈاکٹر فرمان نے ان کے بیان کو اس مضمون میں نقل کیا اور ساتھ ان چودہ اشعار کو بھی درج کیا جو باطن نے نمونہ کلام کے طور پر پیش کیے اور اس کے بارے میں اپنے رائے دیتے ہوئے کہا تھا:

''باطن کا بیان خاصا دلچسپ ہے اور غالب کے کلام اور شخصیت پر جائز و ناجائز بہر حال اولین تنقیدی تحریر کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۱)

گویا ڈاکٹر فرمان نے اس مضمون میں غالب کے اولین تعارفی مضامین کے ساتھ ساتھ ان پر لکھے جانے والے تنقیدی مضمون کا بھی سراغ لگایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے اپنی تحقیقِ بصیرت سے کام لیتے ہوئے ان تعارف نگاروں کو متعارف کروایا ہے جنہوں نے غالب پر اولین مضامین لکھ کر غالب کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور یہ مضامین غالب کو مقبول بنانے میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئے۔

''آثار الصنادید'' سے پہلے غالب کے بارے میں لکھی گئی متفرق تحریروں کی تاریخی اہمیت ہے لیکن فرمان صاحب نے ''آثار الصنادید'' کی اہمیت کو بھی اس لحاظ سے نہایت وقیع اور اہم قرار دیا ہے کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے ممتاز ترین ادیب اور مرزا غالب کے ایک معاصر دوست کا لکھا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لیکن افسوس کہ سرسید کا بیان غالب کے سلسلے میں یکسر رسمی ہے اور اس میں غالب کی زندگی یا کلام کے بارے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کی کسی معاصر تذکرہ نگار سے توقع کی جاتی ہے۔''(۲)

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۲۷

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۳۳

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مضمون ان کی تحقیقی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتا ہے۔سید وقار عظیم نے بھی اس مضمون کی بنیادی خوبی منطقی خوش استدلالی کو بتایا ہے۔فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

''ان میں بڑی سبک رفتاری سے ابھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے جو شوق اور تجسس کو ابھارتی ، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزارتی ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لئے قابل قبول ہو۔''(۱)

(۲)

''غالب ،شاعرِ امروز و فردا'' کا دوسرا مضمون ''غالب اور غالب تخلص کے اردو شعراء'' کے نام سے ہے۔یہ مضمون اس سے پہلے ''صحیفہ'' لاہور کے غالب نمبر میں بھی شائع ہو چکا ہے۔یہ تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ایک ہی تخلص رکھنے والے مختلف شعراء کا حوالہ دیتے ہوئے مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور ان کے ہم تخلص اردو شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔غالب کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں:

''غالب کا نام افقِ شاعری پر آفتاب بن کر اس طرح چمکا کہ اس تخلص یا نام کے دوسرے ستارے یکسر ماند پڑ گئے۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے زیر نظر مضمون میں ان ہی دوسرے ستاروں کا ذکر کیا ہے۔مرزا اسداللہ خاں صاحب اس زمانے کے عام رواج کے مطابق اسد اور غالب تخلص کرتے تھے۔اسد اردو کے لئے تھا اور غالب فارسی کے لئے۔

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب نے بہت جلد اسد تخلص ترک کر دیا اور اردو و فارسی دونوں میں صرف غالبؔ کا استعمال کرنے لگے۔چنانچہ منشی شیونرائن کے نام ۱۸۵۹ء کے ایک

۱۔ ''نقوش'' غالب نمبر۳ ،شمارہ ۱۱۶ (تبصرہ) ص ۶۰۳

۲۔ ''غالب ،شاعر امروز و فردا'' ،ص ۳۶

خط میں خود لکھتے ہیں:

''میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا تھا ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔''(۱)

امتیار علی عرشی نے ان دو چار برسوں میں غالب کی شاعری کا دور اول قرار دیا ہے۔(۲)

غالب تخلص کے اور کئی شاعر اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے دوش بدوش موجود رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جس شہرت اور جس مرتبہ کو مرزا غالب پہنچے، وہ کسی دوسرے غالب کو میسر نہ آیا ورنہ ان میں ایسے قادر الکلام اور صاحب کلام شاعر بھی ہیں جو اساتذہ قدیم کی صف میں آتے ہیں اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ان کے حالات و کلام کا مطالعہ بہر حال ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس تذکرہ کی ضرورت کا ایک پہلو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

''غالب کے بعض محققین اور ان کے کلام کے بعض مرتبین نے کچھ ایسی غزلیں اور اشعار بھی مرزا غالب سے منسوب کر دی ہیں جو حقیقتاً مرزا نوشہ کے نہیں بلکہ کسی دوسرے غالب کے ہیں۔ یہ دھوکا محققین کو صرف اس لئے ہوا کہ انہوں نے غالب تخلص کے دوسرے شعراء کے حالات وکلام پر تحقیقی نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔(۳)

چنانچہ اس مضمون میں خالصتاً اس نکتہ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہ غالب تخلص کے اردو شعراء کا سراغ لگایا جائے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان شعراء کا الگ الگ جائزہ لیا ہے، بہت سی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے دس شعراء کے نام درج کئے ہیں جن میں مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب، مکرم الدولہ بہادر بیگ خان دہلوی (غالب)، انور علی غالب، غالب علی خاں غالب، نواب مرزا امان علی خاں غالب، نواب سید الملک اسداللہ خاں غالب (جو مرزا نوشہ کے ہم تخلص ہونے کے ساتھ ہم نام بھی ہیں)، حکیم محمد خاں غالب،

۱۔ ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۲۱۳

۲۔ دیباچہ دیوان غالب، اردو نسخۂ عرشی، ص ۱۳، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علیگڑھ ۱۹۵۸ء

۳۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۳۸

لالہ موہن لال غالب، دکنی غالب اور حاجی میاں غالب شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے ان تمام شعراء پر نہ صرف الگ الگ تبصرہ کیا ہے بلکہ ان کے حالات جن تذکروں میں تفصیلاً یا برائے نام موجود تھے، ان کا بھی الگ الگ حوالہ دیا ہے اور اس طرح جامع اور مدلل انداز میں ان شعراء کو متعارف کروایا گیا ہے۔ ہر تذکرے میں جو اشعار نمونہ کلام کے طور پر درج کیے گئے ہیں، ان کو بھی اس مضمون میں محفوظ کر دیا ہے۔ ایک اور اہم نکتہ جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ ان غزلوں کا ذکر ہے جو مرزا اسداللہ خاں غالب کے نام سے منسوب کر دی گئیں جبکہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق یہ غزلیں ان کے ہم تخلص شعراء کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی تفصیل اس مضمون میں پیش کی گئی ہے جو غالب سے عقیدت رکھنے والوں کے لیے کئی گرہوں کو کھولتی ہے۔

اس مضمون میں صرف اردو شعراء کے تذکروں کی مدد سے غالب تخلص رکھنے والے اردو شعراء کے حالات اور اشعار کا سراغ لگایا گیا ہے اور اس تمام مدلل تحقیق کے بعد ڈاکٹر فرمان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

> ''غالب تخلص کے متعدد شعراء اردو میں گزرے ہیں، ان میں سے بعض غالب کے معاصر تھے اور اردو فارسی دونوں میں نہایت اچھا کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ایک کے اشعار غلطی سے دوسرے کے نام منسوب کر دیئے ہیں۔''(۱)

(۳)

''غالب، شاعر امروز و فردا'' کا تیسرا مضمون ''غالب کا نفسیاتی مطالعہ'' ہے۔ یہ تنقیدی نوعیت کا مضمون اس کتاب میں شائع ہونے سے پہلے ''نگار'' کے نومبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں غالب کے بیانات اور تحریروں کی روشنی میں غالب کا نفسیاتی مطالعہ

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۴۳

کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان کی تحریروں اور بیانات میں تضاد ہے لہٰذا ان کے متعلق جامع رائے قائم کرنے کے لئے ان کی تمام تحریروں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ یہ رائے نقاد کی تنقیدی صلاحیت کی کمی کو ظاہر کرے گی۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق کسی ادبی شخصیت کے بیانات کو حدیث قدسی خیال کرنا یا ان بیانات کی روشنی میں اس کی سیرت و کلام کی قدر و قیمت متعین کرنا اور تصدیق و تحقیق کے بغیر اس کی باتوں پر کلیتہً بھروسا کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کیونکہ شاعر عام طور پر خارجی زندگی میں ویسا نہیں ہوا کرتا جیسا کہ وہ اپنے کلام میں نظر آتا ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر دنیا کے سارے بڑے شاعروں کی کیفیت یہی رہی ہے۔

کسی شاعر کی جو تصویر اس کے کلام میں ابھرتی ہے، وہ عموماً اس کی عملی زندگی سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا اس کی سیرت و مزاج کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے ان دونوں تصویروں کو سامنے رکھنے اور ان کے متضاد و مخالف پہلوؤں کے اسباب و علل پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان یہاں شاعرانہ تعلّی کا حوالہ دیتے ہیں جو تمام شعراء کے ہاں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، لکھتے ہیں:

> ''اب اگر ان تعلّی آمیز اشعار یا اقوال پر اعتماد کر کے ادبی مراتب کا تعین کیا جائے تو سب سے کم تر درجے کا شاعر سب سے بڑا اور اعلیٰ درجے کا شاعر ادنیٰ نظر آئے گا۔''(۱)

غالب کے ضمن میں بھی اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان نے مختلف مثالیں دی ہیں اور ان کے اقوال اور بیانات کے سلسلے میں خصوصاً محتاط رہنے کی ضرورت پر زور دیا ہے کیونکہ ان کی شخصیت بھی ان کے کلام کی طرح اکہری نہیں، پرت در پرت ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ اس کو بے نقاب کرنے کی بجائے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ ان کے سارے بیانات پر نظر نہیں رکھتے اور صرف کسی خاص بیان یا شعر کی روشنی میں رائے قائم کرتے ہیں تو وہ عموماً گمراہ کن اور غلط ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ ''غالب شاعر امروز و فردا''، ص ۸۷

غالب کے بعض اردو اشعار ان کی خودداری اور انانیت کے عکاس ہیں، مثلاً

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بین ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس کے برعکس ان کے قصائد پر نظر ڈالیں تو بقول شخصے وہ ''پرلے درجے کے خوشامدی اور بھاٹ ہیں''، انہیں قصائد اور مدحیہ قطعات کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں:

''اب اگر کسی کے سامنے اس قسم کی تحریریں ہوں تو وہ غالب کو محض نکما اور خوشامدی خیال کرے گا لیکن یہ خیال درست نہ ہوگا۔ صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے سارے اقوال کو نظر میں رکھنے اور ان کے ماحول ونفسیات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔''(۱)

غالب کی شاعری کے متعلق غالب کے متعدد بیانات کا حوالہ دینے کے بعد ڈاکٹر فرمان نے غالب کی خطوط نگاری یا اردو مثنوی میں پائے جانے والے متضاد بیانات کو تحریر کر کے اپنی رائے کو مزید قابل اعتبار بنایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مضمون میں غالب کی نظم و نثر دونوں سے متعلق ان کے بیانات اور تحریروں میں تضاد کی مزید کئی مثالوں کو پیش کر کے یہ واضح کیا ہے کہ غالب کے ہر قول کو خارجی و داخلی دونوں قسم کے عوامل و دلائل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے کیونکہ غالب بذات خود یہ بھی کہہ گئے ہیں:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر کھلا

۱۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا''، ص ۸۴

(۴)

''غالب اور اقبال'' (۱)، ''غالب، شاعر امروز دفردا'' کا چوتھا مقالہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۵۵ء کے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ میں اسی عنوان سے شائع ہوا، پھر ۱۹۷۰ء میں اس کتاب کی زینت بننے کے بعد بھی یہ مضمون ''اقبال و غالب کا تقابلی مطالعہ'' کے عنوان سے ''نگار'' کے شمارے نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر) میں چھپا۔ البتہ اس کا کچھ حصہ اختتام سے حذف کر دیا گیا۔

یہ مقالہ نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نوعیت کا ہے، اس میں ایک طرف تو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی تحقیقی بصیرت سے اقبال اور غالب کے وہ اوصاف دریافت کیے ہیں جو کسی قدر مشترک ہیں اور پھر ان پر تنقید و تبصرہ کے ذریعے ان میں ربط و تسلسل پیدا کیا ہے۔ مضمون کی صورت تقابلی ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے پہلے اقبال کی ایک خصوصیت بیان کی ہے۔ پھر اس خصوصیت کو غالب میں تلاش کر کے ان دونوں کی فکری ہم آہنگی کو بیان کیا ہے۔ دونوں کو عظیم المرتبت قرار دیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ انہوں نے ہماری شاعری کو نئی اوج گاہوں پر پہنچا دیا۔

اقبال کی ابتدائی شاعری پر داغ کا رنگ نمایاں ہے لیکن بہت جلد ان کی طبیعت غالب کی طرف مائل ہوگئی اور اقبال کا غالب سے یہ تعلق پھر آخری دم تک قائم رہا۔ ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''جاوید نامہ میں ''ازواح حلیلہ'' کے عنوان سے روح غالب اور اقبال کا جو مکالمہ ملتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال آخر تک اپنے ذہنی مسائل کے حل میں روح غالب کے فیض سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔'' (۱)

اپنی رائے کے ساتھ انہوں نے خلیفہ عبدالحکیم کا حوالہ بھی دیا ہے کہ وہ روی،

۱۔ ''غالب، شاعر امروز دفردا''، ص ۹۲

نطشے ،کانٹ، برگساں، کارل مارکس ،لینن ،بیدل اور غالب کے اثرات جو اقبال نے قبول کیے ،ان کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''اقبال کے اندر ان سب میں کسی کی حیثیت جوں کی توں
باقی نہیں رہی ،اس نے اپنے تصورات کا قالین بُنتے ہوئے
کچھ رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں
لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے نقشے کی ہو بہو
نقل نہیں ہے۔''(۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ''روح اقبال'' کے حاشیے میں غالب اور اقبال کے ذوقِ باطنی کی مناسبت کی طرف کہیں کہیں اشارے بھی کیے ہیں۔(۲)

ڈاکٹر فرمانِ فتحپوری نے بھی اس مضمون میں غالبؔ اور اقبال کے ذہنی وفنی اشتراک کا وضاحت سے جائزہ لیا ہے اور بیس (۲۰) سے زائد ایسی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے جو ان دونوں مایۂ ناز فنکاروں میں پائی جاتی ہیں اور ہر نکتے کو ڈاکٹر فرمان نے دلائل اور جواز کے ساتھ پیش کیا اور اس ضمن میں اردو اور فارسی اشعار کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔

غالب اور اقبال دونوں فن اور آرٹ کو با اثر بنانے کے لئے خون دجگر کی آمیزش کو ضروری خیال کرتے ہیں، دونوں شاعری کو سوز دل کے نکاس کی صورت بتاتے ہیں، دونوں حقیقت شناسی کے قائل ہیں، دونوں کے پیش نظر ایک مقصدیت ہے البتہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ان دونوں کی مقصدیت میں امتیاز اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اقبال کی مقصدیت متعین، منضبط اور حکیمانہ ہے اور غالب کی مقصدیت

۱۔ ''رومی، نطشے اور اقبال'' (مشمولہ ''اقبال'' مرتبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق) ص، ۹۹۔۹۸

۲۔ ''روح اقبال'' ص، ۲۳، ۳۱، ۳۵، ۳۹، ۵۲، ۵۹، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۳۴

منتشر، رندانہ اور شاعرانہ۔ اقبال اپنی بات اکثر ذہن کے
ذریعے سے دل میں اتارتے ہیں اور غالب دل کے ذریعہ سے
ذہن میں۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب اور اقبال دونوں کے ہاں آتش نوائی کی صورت ہے۔ دونوں احساسات کی نزاکت کے پیش نظر ذہنی پختگی کے ساتھ باطنی شعور کا سہارا لینا ضروری خیال کرتے ہیں اور جس طرح اقبال اور غالب دونوں خودی کی تسکین کے لئے سرگرداں ہیں، وہاں ان میں ایک تضاد یہ ہے کہ اقبال خود کو شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ایک مکمل فلسفہ حیات رکھتے ہیں۔ اور اس کی تبلیغ و اشاعت ان کا مقصد ہے جبکہ غالب کے پاس کوئی متعین مقصد حیات نہ تھا، اس لئے انہوں نے بحیثیت شاعر ہی فخر محسوس کیا۔

زیر نظر مقالے میں ایک نکتہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ رجائیت جہاں اقبال کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے وہاں غالب کی شاعری میں یہ رنگ اقبال کی مانند نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس حقیقت کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ غالب نے کوئی رجائی فلسفہ پیش نہیں کیا لیکن ساتھ ہی ان کے قنوطی شاعر ہونے کی تردید بھی کرتے ہیں اور اس طرح ان کو اس متوقع الزام سے بچاتے ہیں:

''اگر ان کی مجموعی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کریں اور انسان کے
عمل کی کسوٹی پر اس کے تاثرات کو پرکھیں تو پھر انہیں رجائی
شاعر کہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'' (۲)

اقبال کے ہاں خودی کی جو صورت ہے، وہ غالب کے ہاں تو نہیں ملتی لیکن وہ ادراکِ ذات جسے اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ غالب کو بھی عزیز تھی۔ اس بیان کے جواز میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے حالی کا بیان درج کیا ہے:

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۹۹

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۰۱۔۱۰۲

"مرزا خودداری اور حفظ وضع کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ امراء و عمائد سے برابری کی ملاقات رکھتے تھے۔ جو کوئی ان کے مکان پر نہ آتا، وہ بھی اس کے یہاں نہ جاتے اور وقار و عزت کو سب پر مقدم جانتے۔"(۱)

لیکن شاعر کے قول و فعل میں قطعی مطابقت نہیں پائی جاتی اور اسی کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"عالم، باعمل کبھی نہیں ہوتا اور اس میں غالب و اقبال دونوں برابر ہیں۔"(۲)

اس کے علاوہ اقبال اور غالب کے افکار میں جو مماثلتیں اس مقالہ میں بیان کی گئی ہیں، ان میں جہاں ان کا تصور عشق اور وصال اور انسانی فضیلت کا تصور شامل ہے، وہاں غالب اور اقبال دونوں بنی نوع انسان کو صرف یقین، عمل اور محبت کے رشتوں سے باہم مربوط کرنا چاہتے ہیں اور عالمگیر اخوت کے حامی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق نئی نئی آرزوؤں اور خواہشوں کی تمنا زندگی کی دلیل ہے اور یہ دلیل ان دونوں شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ اقبال اور غالب دونوں انسانیت کی معراج یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کی قوت تسخیر جہانِ ظاہر سے بلند ہو، اسی لئے دونوں اپنے ماحضر سے مطمئن نہیں اور اپنی دنیائے تمنا کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نقطۂ نظر کے مطابق غزل کا رنگ اقبال کی نسبت غالب کے ہاں اپنی تمام تر جلوہ افروزیوں کے نظر آتا ہے کیونکہ غالب کے اشعار میں جو حسرت ناک اور پرخلوص تاثر کام کر رہا ہے، وہ اقبال کے یہاں نہیں ہے اور یہ اسی تاثر کے ضعف و توانائی کا فرق ہے کہ غالب کے اشعار ضرب المثل بن گئے اور زندگی کی ہر شدید الجھن میں اس طرح ہمارے لب پر آ جاتے ہیں کہ:

۱۔ "یادگار غالب" مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور، ص ۶۱

۲۔ "غالب، شاعر امروز و فردا"، ص ۱۰۸

''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''

ان مماثلات کو جو اقبال اور غالب کے کلام میں پائے جاتے ہیں، بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر فرمان اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے خیالات وافکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں ہیں۔ اپنے اس خیال کو مزید تقویت دینے کے لئے ڈاکٹر فرمان سر عبدالقادر کے دیباچہ کا حوالہ دیتے ہیں:

> ''غالب و اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔۔۔۔ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں بھی چین سے نہ رہنے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہوں اور شاعری کے چمن کی آبیاری کریں اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور اقبال نام پایا۔''(۱)

لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری اقبال کو غالب کا دوسرا جنم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ جو قبول عام غالب کو میسر آیا، وہ اقبال کو نصیب نہ ہوا کیونکہ غالب محض شاعر ہیں اور اقبال شاعر و فلسفی دونوں درجوں پر فائز ہیں۔ اس لئے وہ زیر نظر مقالہ میں تمام بحث کا منطقی نتیجہ یہی نکالتے ہیں کہ اقبال غالب کی ارتقائی روح اور غالب، اقبال کے پیش رو نہیں بلکہ اقبال نے جہاں دوسرے حکماء سے استفادہ کیا، وہاں غالب سے بھی مستفید ہوئے۔

(۵)

''غالب شاعر امروز و فردا'' میں ''غالب اور اقبال'' کے عنوان سے دو مضامین شائع ہوئے۔ ایک کا ذکر ہم نے پہلے کیا، یہ دوسرا مضمون اسی کی توضیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دوسرا مضمون ''نگار'' مئی ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اسے ہم تحقیقی و تنقیدی دونوں

۱۔ ''کلیات اقبال'' اردو مطبوعہ اقبال اکیڈمی، پاکستان، لاہور، ص ۳۵

اوصاف کا حامل مضمون قرار دے سکتے ہیں۔ ''غالب اور اقبال'' کے عنوان سے جو مضمون ''نگار'' دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر فرمان نے دونوں شعراء کے کلام میں پائی جانے والی مماثلتیں اور ان میں امتیازات کو بیان کر کے غالب اور اقبال دونوں کو عظیم المرتبت شاعر قرار دیا تھا، اس کو بعض حضرات نے اس زاویہ نگاہ سے دیکھا کہ اسے اقبال کی تنقیص خیال کرتے ہوئے اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ایک حضرت نے تحریباً قاعدہ طور پر ''نگار'' کے مارچ ۱۹۵۶ء کے شمارے میں ان نکات کو اٹھایا جس میں بقول معترض اقبال کی تنقیص اور غالب کی بے جا تعریف کی گئی ہے، نہ صرف یہ بلکہ انتقاماً ایک صفحہ سے زائد غالب کے ایسے اشعار پیش کر دیئے جن میں غالب نے فارسی اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

> ''اگر اس سے کسی شاعر کی نا اہلیت یا کمزوری ثابت کی جا سکتی ہے تو یہ کمزوری و نا اہلیت اقبال میں بہ نسبت غالب کے زیادہ نمایاں نظر آئے گی۔ اس لئے کہ ان کے اکثر افکار و خیالات دوسروں سے ماخوذ ہیں۔''(۱)

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اعتراضات کا جواب نہایت مدلل انداز میں اور ثابت قدمی سے دیا ہے اور اس اعتراض کی نفی کی ہے کہ اس میں اقبال کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس مقالہ میں اقبال کے کمزور پہلوؤں اور اشعار کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے اور صرف ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جو مقبول ہوئے اور ان کے شاعرانہ مقام و مرتبہ کی بلندی کا سبب ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اس مضمون کو اقبال کی تنقیص قرار دینے کو تنگ نظری اور شخصیت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اول ان تمام اعتراضات کو جو اٹھائے گئے، بیان کیا اور پھر ہر اعتراض کے جواب میں ایک سے زائد نقادوں کے حوالے دیئے ہیں اور وہ بھی

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۲۸

صرف ان نقادوں کے جو اقبال شناس کی حیثیت سے اہم مقام و مرتبہ رکھتے ہیں یا اقبال سے قلمی و ذہنی تعلق میں بندھے ہوئے ہیں تاکہ ان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش کم ہو۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر فرمان نے اپنے پہلے مضمون میں غالب و اقبال کے تقابلی مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا:

''اقبال کے خیالات و افکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو ان کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں ہیں۔''(۱)

جسے اقبال کی تنقیص خیال کیا گیا لیکن ڈاکٹر فرمان اس کی تردید اور اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پانچ اقبال شناسوں کے حوالے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بقول اقبال نے بذاتِ خود اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے اختتام تک غالب سے معنوی فیض حاصل کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے یہاں مولوی عبدالحق کا قول نقل کیا ہے:

''اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔''(۲)

بلکہ آل احمد سرور جو اقبال کے بڑے مداح ہیں، ''نئے اور پرانے چراغ'' میں نہ صرف اقبال کے افکار بلکہ اسلوب کو بھی غالب سے متاثر بتاتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ میں ڈاکٹر فرمان نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں نہ صرف اقبال سے عقیدت رکھنے والے نقادوں کے حوالے دیئے بلکہ غالب کی عظمت کے اعتراف میں خود اقبال کی آراء کو بھی پیش کیا ہے۔ اپنے پہلے مضمون میں ڈاکٹر فرمان نے غالب و اقبال میں پائی جانے والی تمام مماثلتوں کے باوجود اقبال کو غالب کا دوسرا جنم تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کیونکہ اقبال کی نسبت غالب کی فن شاعری پر گرفت بہت زیادہ مضبوط ہے اور جو شاعرانہ عظمت اور اثر آفرینی غالب کے کلام میں پائی جاتی ہے، وہ اقبال کے ہاں کمیاب

۱۔ ''غالب اور اقبال'' (۱): مشمولہ: ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۱۲۳

۲۔ ''تنقیدات عبدالحق''

ہے چنانچہ جاوید اقبال خود غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب آج بھی زندگی کا سب سے بڑا عکاس ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری غالب کی عظمت کو اس طرح سراہتے ہیں:

''انہیں اپنے فن کی توانائی اور تازگی پر اعتماد تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ زمانہ کی آشنائی و ناقدردانی کے باوجود صرف اپنے دم خم کے سہارے آگے بڑھتا چلا گیا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان نے اپنے پہلے مضمون ''غالب اور اقبال'' مطبوعہ ''نگار'' (دسمبر ۱۹۵۵ء) کے حوالے سے اٹھائے گئے اعتراضات کے جواب میں واضح کیا ہے کہ اس مضمون سے کسی طور پر اقبال کی تنقیص کا پہلو نہیں نکلتا اور یہ کہ اقبال کی اہمیت دوسرے حکماء، علماء اور غالب سے فیض حاصل کرنے کے باوجود اپنے دور، اپنے زمانے اور اپنے فلسفہ حیات کے لحاظ سے مسلم ہے۔

(۶)

''غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو''، ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کا چھٹا مضمون ہے۔ تنقیدی نوعیت کا یہ مضمون اس سے پہلے اسی نام سے رسالہ ''نگار'' کے ''غالب نمبر'' جنوری، فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت کے ۲۵ برس بعد بھی اپنے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے کو ڈاکٹر فرمان نے اپنی دوسری کتاب ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں شامل کیا۔

اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے کلام کے ایک اور اہم پہلو ''طنز'' سے بحث کی ہے اور اس طنز کی انفرادیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں برجستگی کے ساتھ معنوی تہہ داری بھی ملتی ہے اور یہ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ غالب اپنے ماحول و

۱۔ ''دیوان غالب'' مرقع چغتائی

۲۔ ''غالب شاعر امروز و فردا، ص ۱۴۷

شخصیت میں مطابقت پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اپنے لاشعور یا ذات سے آگاہ تھے۔

حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کو حیوان ظریف کہا اور یہ لکھا:

''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔''(۱)

لیکن غالب کے خطوط اور کلام میں یہ شوخی و ظرافت ہی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ان کے اسلوب فن کا امتیازی نشان ان کا وہ طنزیہ لہجہ ہے جو کم از کم اردو غزل کی تاریخ میں بالکل نیا ہے۔ غالب کے طنزیہ اسلوب اور لہجے کا اثر لمحاتی نہیں بلکہ اس میں معنی خیز طنز کے دیرپا نشتر پنہاں ہوتے ہیں، اسی بنا پر ان کے طنز میں اعلیٰ درجے کی ادبیت کا آجانا یقینی تھا۔

غالب کے ہاں طنزیہ انداز اور نوعیت کے سلسلے میں ان کی شخصیت اور ماحول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ غالب کا تعلق ایک شکستہ حال زمانے سے تھا لیکن انہوں نے اپنے ماحول سے کبھی شکست نہ کھائی بلکہ ان کی آرزو خیز طبع اس ماحول سے نبرد آزما ہوتی رہی لیکن وہ اپنی حسرتوں کو مارنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ غالب کی شکست نہ ماننے والی شخصیت نے فکری طور پر انہیں اپنے پیش رووں اور معاصر شعراء سے نہ صرف ممتاز کیا اور ان کے طنزیہ لہجے میں تیرِ نیم کش کی خلش پیدا کر دی۔

غالب کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں مزاح برائے مزاح کے سوا اور کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن غالب کے ہاں ڈاکٹر فرمان کے اندازے کے مطابق ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اس کی نسبت طنزیہ لہجہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس لحاظ سے وہ غالب کو انشاء اور سودا پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''انہیں محض شوخ نگار نہیں بلکہ اردو کا پہلا طنز نگار غزل گو شاعر سمجھنا چاہیئے۔''(۲)

۱۔ ''یادگارِ غالب'' مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور، ص ۶۰

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۵۲

غالب کے کلام کا طنزیہ انداز موضوعات کے اعتبار سے وسعت وتنوع کا حامل ہے اور اس طنز کی غائیت تعمیری ہے۔ڈاکٹر فرمان نے غالب کے طنزیہ اسلوب کو ان کے کلام کے مختلف حوالوں سے روشن کیا ہے اور یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ غالب براہ راست کسی کو طنز کا ہدف نہیں بناتے ، بلکہ عام واقعات کے بیان میں صرف اسلوب کی مدد سے خصوصی طنز کا لہجہ پیدا کر دیتے ہیں۔

زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر فتحپوری نے غالب کی حضرت عیسیٰ علیہ، حضرت موسیٰ علیہ، حضرت یوسف علیہ، حضرت ابراہیم علیہ، منصور، فرہاد، واعظ و ناصح پر طنز کی مثالیں پیش کی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ غالب کا ان تمام افراد کو نشانۂ طنز بنانا بالواسطہ تمام سماج پر طنز ہے کیونکہ ان افراد کے پس منظر میں سماج کا ایک بڑا گروہ ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس مضمون میں غالب کے ان اشعار کو بھی درج کیا ہے جن میں غالب نے استاد شہہ، بہشت، نامہ بر، حتیٰ کہ اپنے محبوب پر بھی طعن کی ہے بلکہ خود پر طنز کی جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو یہ کہہ کر مسکراتے ہیں :

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے (۱)

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اسلوب کے تیکھے پن میں طنزیہ لہجہ کو خاص دخل ہے۔مزاح کہیں کہیں ہے اور طنز جگہ جگہ۔اپنے رائے کے جواز میں وہ شیخ محمد اکرام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب کائنات کی ہر چیز کی ہنسی اس طرح اڑاتے ہیں جیسے کائنات کے ہر نادان و دانا کے راز سے آشنا اور کمزوریوں سے واقف ہیں۔"(۲)

۱۔ "غالب، شاعر امروز وفردا"، ص ۱۶۸

۲۔ "غالب، شاعر امروز وفردا"، ص ۱۶۹

(۷)

''غالب، شاعر امروز و فردا'' کا ساتواں مقالہ ''مکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر'' کے نام سے ہے۔ یہ تنقیدی نوعیت کا مقالہ ہے جو ابتداً ''نگار'' لکھنؤ جولائی ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔

اس مقالہ میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مولانا عبدالباری آسی لکھنوی کی شرح دیوان غالب بعنوان ''مکمل شرح دیوان غالب'' کا بنیادی تعارف کروایا ہے اور دیوان غالب کے آٹھ اشعار کا انتخاب کر کے اس پر تنقید کرتے ہوئے جہاں عبدالباری آسی کی تحریر کردہ شرح کے نقائص بیان کئے ہیں، وہاں ان نکات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جو قابل اعتبار ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں شامل اشعار کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کلام غالب سے اس مخصوص شعر کے ہم مضمون اشعار کا حوالہ دیا ہے اور دوسرے قابل قدر شعراء کے ہاں اس نوعیت کے جو اشعار ہیں، ان کو بھی درج کر کے اپنی شرح کا جواز پیدا کیا ہے۔ آسی کی شرح پر تنقید کرتے ہوئے اور اشعار کی اپنے نقطۂ نظر سے تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کی عظمت اور انفرادیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے شعر

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کی وضاحت میں غالب کے حسن کلام کو یوں سراہتے ہیں:

''جس رمز و تجاہلِ عارفانہ سے ''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی'' کا استعجابی استفسار قائم کیا گیا ہے، اس کی مثالیں اردو شاعری میں کم ملیں گی۔''(۱)

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۸۱

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان اشعار کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو بیان کر کے اپنی رائے کو ہمارے ذہنوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر لفظ اور ہر جملہ کی غرض و غایت اور نوعیت کو بیان کر کے گویا شعر کے تمام رموز آشکار کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی عبدالباری آسی کی کمزور مطلب نگاری پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر بجنوری، نظم طباطبائی اور حسرت کی شرحیں آسی صاحب کے سامنے تھیں۔ پھر بھی خدا جانے کیوں صحیح اور قرین قیاس مضمون سے گریز کیا گیا ہے۔''(۱)

اس مقالہ کے تجزیے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالباری آسی نے اشعار کے قریب کے معنی بیان کئے ہیں یا پھر ان کی سادہ نثر کر دی ہے جبکہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ہر شعر کی تہہ میں پہنچ کر بعید کے معنی تک رسائی حاصل کر کے شعر کے اصل گوہر کو نکال دیتے ہیں۔

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۸۴

پانچواں باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اہم کتاب:

''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' کا تجزیاتی مطالعہ (۲)

غالب صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئیں ۔۔ لیکن بقا صرف ان چیزوں کے لئے ہے جو عالمِ انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں ۔۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب ''غالب، شاعرِ امروز و فردا'' اُن کے کم و بیش ایک چوتھائی صدی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطۂ نظر میں تازگی اور اسلوب میں توانائی ہے، اور اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اہم کتاب غالب صدی پر شائع ہونے والی اُن سینکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے، جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

تجزیاتی مطالعہ (۲)

''غالب کے کلام میں استفہام'' فکر غالب کے حوالے سے اردو میں ڈاکٹر فرمان کا پہلا تنقیدی مضمون ہے جس میں غالب کے مفکرانہ رویے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مقالہ پہلی بار ''نگار'' لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں چھپا، دوسری مرتبہ ''تحقیق و تنقید'' (طبع اول ۱۹۶۳ء) میں، اس کے بعد ''نگار'' لکھنؤ کے غالب نمبر جنوری و فروری ۱۹۶۹ء میں، اس کے علاوہ ''تنقید غالب کے سو سال'' مرتبہ فیاض محمود (۱۹۶۹ء) اور پھر ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کی زینت بننے کے بعد ''نگار'' فروری ۱۹۸۷ء کے شمارے میں اور پھر سہ ماہی ادیب علی گڑھ جنوری تا جون ۱۹۹۲ء میں چھپا۔ یہ تنقیدی نوعیت کا مقالہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ غالب کی صد سالہ تاریخ وفات کے سلسلے میں شائع ہونے والی ایک اہم کتاب ''تنقید غالب کے سو سال'' میں اسے جگہ ملی۔

زیر نظر مقالہ میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کلمات استفہام کی روزمرہ تقریر و تحریر میں اہمیت کو بیان کرتے ہوئے غالب کے کلام میں ان کی نوعیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ''غالب کے کلام میں استفہام'' پر بااعتبار موضوع پہلی مرتبہ قلم اٹھایا گیا اور غالب کو ایک نئے رخ سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کلام غالب کے استفہامیہ لب و لہجے کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور و فکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔'' (۱)

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی'' از ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، مشمولہ: ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، ترتیب و تدوین: امراؤ طارق، ص ۲۶۶

ڈاکٹر فرمان بھی اسی نقطۂ نظر کی توجیہہ اس مقالے میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات ہیرے کی کان میں ہیروں کی بے پناہ تابنا کی سے بڑے سے بڑے جوہری کی نظرِ انتخاب چوک جاتی ہے اور نگاہ جلوۂ حقیقی سے محروم رہ جاتی ہے۔ اسی بناء پر کلامِ غالب کی بھی اکثر خصوصیتیں نظر آتے ہوئے بھی نظر نہیں آتیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے جدت بیان میں عموماً استفہامیہ لب ولہجہ سے کام لیا۔

استفہامیہ کلمات کو کس نوعیت اور کن حوالوں سے استعمال کیا جانا چاہیے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے کلام سے مثالیں دے کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ کلماتِ استفہام کو جن معنوں میں استعمال کیا جانا چاہئے، اس کی وضاحت کے بعد غالب کے کلام میں ان کلمات کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ غالب نے کلماتِ استفہام کی گہرائیوں اور لطافتوں کو شدت سے محسوس کیا اور استفساریہ اندازِ بیان میں پورا زور صرف کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اسلوب بیان کی جدت کا راز بڑی حد تک اس استفہامیہ لب ولہجہ میں پوشیدہ ہے اور انہوں نے اپنی تخلیق کو جدت خیالی سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ شعریت کے نغمئے دلکش سے دلکش تر ہو گئے۔ اسی مضمون کے حوالے سے عبدالرحمٰن ناصر لکھتے ہیں:

> ''ان کے استفہامیہ لب و لہجے سے ان کی جدت طرازی، مشکل پسندی، اور فلسفیانہ طرزِ فکر، تینوں چیزوں کا سراغ ملتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلمات استفہام کے استعمال سے جیسا فائدہ شاعری میں غالب نے اٹھایا ہے، کسی دوسرے شاعر نے نہیں اٹھایا۔'' (۱)

غالب کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا ؎
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

۱۔ ''نظریہ، نظریاتی مباحث اور فرمان فتحپوری'' مضمون نگار: عبدالرحمٰن ناصر، مشمولہ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات وخدمات)'' ترتیب وتدوین: امراؤ طارق، ص ۴۲۱

میں کلمات استفہام کی اہمت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''پوری غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے لیکن اگر اس غزل سے وہ اشعار حذف کر دیئے جائیں جن کا انداز استفہامیہ ہے تو غزل بے جان ہو جائے گی۔''(۱)

چنانچہ اس غزل کے مذکورہ اشعار کو بھی اس مقالہ میں ڈاکٹر فرمان نے درج کیا ہے اور اس طرح یہ واضح کیا ہے کہ ایک تہائی سے زائد اشعار اسی رنگ کے ہیں۔

''یادگار غالب'' میں حالی نے غالب کی اس خصوصیت کو کہ ان کے اشعار بادی النظر میں کچھ اور معنی اور مفہوم رکھتے ہیں مگر غور و فکر کے بعد ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، غالب کی اس انفرادیت کی وجہ ان کے استفہامیہ لب ولہجہ میں تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلام غالب میں جہاں کہیں توجیہہ اور ابہام کی صنعتیں ملتی ہیں، وہ صرف غالب کے استفہامی انداز کا کمال ہے۔''(۲)

چنانچہ اس مقالہ میں غالب نے جس انداز میں کون، کیا، کب، کیوں، کب تک اور کیوں کر، وغیرہ کے استعمال سے استفہام کی جن مختلف اقسام کو پیدا کیا ہے، اس کو بیان کیا ہے اور غالب کے ذومعنی اشعار کو بھی انہیں کلمات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر فرمان کہتے ہیں:

''یہ استفہام کہیں برائے استعجاب ہے کہیں استفسار سے صنعت سوال و جواب پیدا کی گئی ہے، کہیں توجیہہ و اوھام، کہیں قوافی استفہامیہ ہیں کہیں ردیف، کہیں ایک مصرعہ میں استفسار قائم کیا گیا ہے، کہیں دونوں میں کہیں کلمات استفہام کی مدد سے یہ رنگ چڑھایا گیا ہے، کہیں صرف لب ولہجہ سے۔''(۳)

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۱۹۴

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۲۰۰ (۳) ایضاً، ص ۱۹۲

اس طرح یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ غالب کے دیوان کے تیز تر نشتر انہیں غزلوں میں ملیں گے جن کے قوافی اور ردیف استفہامیہ ہیں اور وہ غزلیں جو زبان زد ہو چکی ہیں، اگر انہیں دیوان سے خارج کر دیا جائے تو دیوان غالب بے جان ہو جائے۔ چنانچہ اس مقالہ میں زیر بحث موضوع کی ندرت اور انفرادیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کہتے ہیں:

''چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سر مو فرق نہیں آیا۔''(۱)

(۹)

''غالب شاعر امروز و فردا'' کا نواں (۹) مقالہ ''غالب، ''نسخۂ حمیدیہ'' کی روشنی میں''، نیم تنقیدی اور نیم تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس تصنیف کی زینت بننے سے پہلے یہ ماہ نو (کراچی) میں جنوری فروری ۱۹۶۹ء (غالب نمبر) میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے اردو دیوان کے قدیم نسخے ''نسخۂ حمیدیہ'' اور ان کے متداول اردو دیوان کا تجزیہ کر کے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اہمیت کو بیان کیا کہ اس سے غالب کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ان تبدیلیوں کا حوالہ دیا ہے جو غالب نے ''نسخہ حمیدیہ'' میں کیں اور ان ترامیم، تنسیخ اور اضافے کے بعد اس منتخب کلام کو اردو دیوان کے نام سے شائع کیا۔ اپنی بات کی وضاحت میں ڈاکٹر فرمان نے اشعار کے حوالے بھی پیش کئے ہیں۔ غالب کا اہم اردو دیوان ''نسخۂ حمیدیہ'' جسے خود غالب نے ابتداً ردیف وار مرتب کیا تھا۔ بعد ازاں اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال سے دستیاب ہوا اور پھر انوار الحق ڈائریکٹر یٹ تعلیمات ریاست بھوپال نے اسے عبدالرحمٰن

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی'' مضمون نگار: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مشمولہ: ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)''، ترتیب و تدوین: امراؤ طارق، ص ۲۶۶

بجنوری کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ غالب کی زندگی اور اس کے بعد بھی ان کے مروجہ دیوان کے کئی ایڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے لیکن ان سب کا ماخذ ''نسخہ حمیدیہ'' ہی قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق نسخہ حمیدیہ کی اشاعت سے ان کی مقبولیت و شہرت کے امکانات کچھ اور بڑھ گئے ہیں کیونکہ جب کسی عظیم شخصیت کے سامنے اس کی کمزوریاں رکھی جاتی ہیں تو اس کی عظمت کچھ اور نکھر جاتی ہے اور ''نسخہ حمیدیہ'' کی اشاعت سے غالب کے فکر و فن کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے سمجھانے کے علاوہ اس بات کا بھی تعین ہوا کہ غالب کا ''اردو کلام'' صرف چوبیس (۲۴) سال کی عمر میں دیوان کی صورت میں مرتب ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق ''نسخہ حمیدیہ'' کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ:

> ''غالب کے بعض ایسے دعووں اور بیانات کی تصدیق ہو گئی جنہیں کسی خارجی شہادت کی عدم موجودگی میں غلط سمجھا جاتا تھا یا شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''(۱)

اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس مضمون میں غالب کے ان خطوط کے اقتباسات دیئے ہیں جن میں کسی بیان یا دعویٰ کا ذکر ہے اور پھر نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں ان کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان غزلوں کے ابتدائی حالات کو بیان کیا جن میں غالب نے تبدیلیاں کر دیں۔ غالب نے نسخۂ حمیدیہ میں جگہ جگہ شعروں اور مصرعوں میں تبدیلیاں کی ہیں، کہیں پورا مصرعہ بدل دیا ہے، کہیں مصرعے کا ایک ٹکڑا اور کہیں صرف ایک آدھ لفظ۔ یہ تبدیلیاں نہ صرف شعر کے حسن ظاہری و معنوی کو عیاں کرتی ہیں بلکہ غالب کے تنقیدی شعور کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے یہاں اشعار کے حوالے دے کر دیوان حمیدیہ اور مروجہ دیوان دونوں میں فرق کی صورت کو بیان کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۲۱۳

اصلاح، ترمیم اور تنسیخ کا یہ عمل سارے نسخۂ حمیدیہ میں نظر آتا ہے۔ غالب نے جن ردیفوں کی پوری غزلیں محذوف کر دی، ان کی طرف ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے واضح اشارے کرتے ہوئے یہ لکھا:

''کسی شاعر کے لئے اپنے اشعار کا اس طرح قلمزد کر دینا آسان نہیں ہوتا۔''(۱)

اس خیال کے جواز میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے حالی کا بیان بھی نقل کیا ہے:

''اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا۔''(۲)

لیکن اس عمل تنسیخ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے مروجہ دیوان میں اصل نسخے سے کچھ لیا ہی نہیں یا صرف چند اشعار لئے ہیں بلکہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب نے اس میں سے ایک چوتھائی یعنی ساڑھے چار سو سے کچھ زائد اشعار منتخب کئے ہیں جو غالب کے مروجہ دیوان میں عطر خیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مقالے میں ۲۹ غزلوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جو مقبول عام ہوئیں اور انہیں نسخۂ حمیدیہ ہی سے منتخب کیا گیا لیکن صرف یہی غزلیں قابل انتخاب نہ تھیں بلکہ ''نسخۂ حمیدیہ'' میں ایسے سینکڑوں اشعار موجود ہیں جو مضامین خیالی یا رنگ بیدل سے پاک ہیں اور غالب کے فکر وفن کے بالکل تازہ پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں، ان میں غالب کا یہ مشہور شعر بھی شامل ہے ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

یہ اشعار صرف نسخۂ حمیدیہ کی دین ہیں اور غالب کے مروجہ دیوان میں نہیں ملتے

۱۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا''، ص ۲۲۳

۲۔ ''یادگار غالب''، مطبوعہ ملک نذیر احمد، تاج بکڈپو، اردو بازار، لاہور، ص ۱۴۱

لیکن ڈاکٹر فرمان کے مطابق اگر یہ سامنے نہ آجاتے تو کلامِ غالب کے بعض اہم نکات ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقالات و منتخبات کے ذریعہ لوگ، ان اشعار سے اس طرح مانوس ہیں گویا وہ انہیں، غالب کے مروجہ دیوان میں مدت سے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اسے غالب کے فکروفن کا جادو قرار دیا ہے۔

غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو اپنی ریختہ شاعری کے متعلق لکھا تھا کہ:

''۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا تھا، ۱۰ برس میں دیوان جمع ہوگیا، آخر تمیز آئی، اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔''(۱)

اس بیان کے آخری ٹکڑے کو مولانا امتیاز علی عرشی نے مبالغہ خیال کیا کہ منتخب اشعار کی واقعی تعداد دس پندرہ نہیں کہیں زیادہ تھی اور اس کے اوراق یک قلم چاک کر دینا صاف مبالغہ ہے۔ (۲)

لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری، امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے اس خیال کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں اور غالب کے خط کے سیاق وسباق کے پیش نظر اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ غالب نے اپنے دیوان کے اس حصے کو جس پر بیدل کی تقلید کا گہرا اثر ہے، اپنی سمجھ میں پورا انتخاب سے خارج کر دیا ہے اور صرف دس پندرہ شعر بطور نمونہ اپنے انتخاب میں شامل کر لئے تھے تا کہ ان کے ابتدائی رنگ سخن کا اندازہ لگایا جا سکے۔ پھر غالب کے بیان کا یہ آخری ٹکڑا کہ:

''دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے''

اس کا جواز ڈاکٹر فرمان یہ بیان کرتے ہیں کہ جہاں سادگی وسلاست کو معیار

۱۔ ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۴۵۴

۲۔ ''مقدمہ دیوان غالب اردو نسخۂ عرشی''، مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۴

قرار دے کر غالب نے اپنے ابتدائی مجموعہ کلام سے تقریباً ساڑھے چار سو اشعار منتخب کئے، وہاں چند اشعار بطور نمونہ، مشکل و مغلق بھی منتخب کر لئے تا کہ ان کے ذریعہ ان کے پرانے اور نئے اسلوب سخن میں امتیاز کیا جا سکے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان نے اس مقالہ میں غالب کے منتخب و مروج اردو دیوان سے بارہ اشعار کو درج کر کے غالب کے ابتدائی اور مشکل پسند رنگِ سخن کی وضاحت کی ہے اور غالب کے خط کے اس آخری ٹکڑے کو جس میں دس پندرہ اشعار کو نمونتاً رہنے دینے کا اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق آسان و عام فہم اشعار کی جانب نہیں بلکہ مشکل و ژولیدہ کی طرف ہے چنانچہ اس طرح اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالب کا مطالعہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کی روشنی میں کرتے ہیں اور اس کی اہمیت کو بنیادی قرار دیتے ہیں۔

(۱۰)

''غالب، شاعر امروز و فردا'' جس کی مناسبت سے ڈاکٹر فرمان نے غالب پر اپنی پہلی تصنیف کا نام تجویز کیا۔ اس تصنیف کا حصہ بننے سے پہلے ''شاعر'' بمبئی کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء اور ہمدرد صحت، کراچی جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ مقالہ نوعت کے اعتبار سے نیم تنقیدی اور نیم تحقیقی مزاج کا حامل ہے۔

سید وقار عظیم کے خیال میں:

> ''کسی شاعر کو بہ یک وقت شاعر امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیانی فصل و بعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔'' (۱)

۱۔ ''غالب: شاعر امروز و فردا'' از سید وقار عظیم، مشمولہ ''نقوش'' غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، ۱۹۷۱ء، ص ۶۰۴

ڈاکٹر فرمان نے اس مقالے میں غالب کی اسی انفرادیت کے پیش نظر یہ واضح کیا کہ غالب نے غزل کو محدود موضوعات سے نکال کر اس میں وسعت اور تنوع پیدا کیا اور اردو شاعری کو عموماً اور غزل کو خصوصاً ایک نئے جہان معنی سے آشنا کیا اور اسی بناء پر اردو غزل حسن وعشق اور مسائل تصوف سے آگے بڑھ کر افکار سنجیدہ اور جملہ مسائلِ حیات کی ترجمان بھی بن گئی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کو شاعر امروز وفردا قرار دیا اور غالب کے لئے اس اعزاز کو ناگریز قرار دیتے ہوئے لکھا:

''غالب چونکہ اردو شاعری میں بالکل ایک نئی راہ کے مخترع ہیں، اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنے عہد کے شاعر نہیں بلکہ شاعر امروز فردا بھی ہیں۔''(۱)

غالب کا عہد کہنے کو تو مسلمانوں کا عہد تھا، لیکن مسلمان حکمران عملاً ایک مدت سے انگریزوں کے زیر نگین تھے اور اس کے ساتھ تعصب وتنگ نظری کا شکار رتھے۔ لیکن غالب بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا احساس اور وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں کا شعور اوائل عمری ہی سے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام کلکتہ کے وقت بھی ذہنی الجھن میں گرفتار رہنے اور پنشن کی بحالی کا کام نہ ہونے کے باوجود غالب کلکتے کی نئی تہذیبی زندگی سے بدگمان نہیں ہوئے بلکہ ایک وسیع النظر فرد کی حیثیت سے وہاں کی سیاسی ومعاشرتی تنظیم کے متعلق اچھے خیالات و تاثرات لے کر واپس ہوئے۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق اس سیاسی شعور کی بناء پر ''آئین اکبری'' پر تقریظ لکھنے کی فرمائش جب سرسید نے کی تو غالب نے اس کام کو رجعت پسندی اور مردہ پروری قرار دیا اور سائنس کی سہولتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نئی تہذیب کی آمد کا مژدہ سنایا۔ غالب کی اس خصوصیت کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس طرح بیان کیا:

''ان میں زندگی کی نئی قدروں کو خوش آمدید کہنے اور ان کو اپنا لینے کا خاص ذوق تھا۔''(۲)

۱۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا''، ص ۲۵۵ (۲) ایضاً، ص ۲۴۸

زندگی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان غالب کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں کہ انسان زندگی کے مروجہ اقدار و روایات سے یکسر قطع نظر زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن اس کے لئے ماحول سے بغاوت بھی ناگزیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ باوجود چند تقلیدی رجحانات کے غالب کی شخصیت اور شاعری کا قوی ترین رجحان روایات سے بغاوت، موجود سے بے اطمینانی اور تقلید سے بیزاری ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے ہاں ان صورتوں کو غالب کے خطوط کے اقتباسات سے واضح کیا ہے۔مثال کے طور پر وہ کسی کی تقلید سے بچنے کی کوشش کس حد تک کرتے ہیں، اس کا اندازہ تفتہ کے نام ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔لاحول ولا قوۃ۔''(۱)

روایتی اور بند ٹکے خیالات کی بجائے تازہ اور نئے میلانات کو اپنانے کی وجہ سے ان کی سخن گوئی مروجہ انداز غزل گوئی سے بہت الگ ہوگی اور اسی بناء پر ان کی شاعری کا مذاق اڑایا گیا اور ساتھ ہی ان کے کلام کو لغو اور بے معنی گروانا گیا۔لیکن غالب کو اس بات پر کامل یقین تھا کہ ان کے کلام کو بہر حال قبول عام حاصل ہوگا، ان کی زندگی میں نہ سہی، مرنے کے بعد سہی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی نظر میں غالب کے عہد میں ان کی نامقبولیت کے دو اسباب ہیں۔''ایک یہ کہ فکر وفن کے باب میں غالب کا تنقیدی شعور اپنے اکثر معاصرین سے ذرا مختلف تھا۔اس سے بڑھ کر کہ وہ اس شعور کے اظہار میں حد درجہ بے باک واقع ہوئے تھے اور اس بے باکی نے ان کے اکثر احباب و معاصرین کو ان سے بدگمان و ناراض کر رکھا تھا۔(۲)

۱۔ ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۱۶۳

۲۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ص ۲۵۰

ڈاکٹر فرمان فتحپوری غالب کی اپنے عہد میں نامقبولیت کا ایک سبب غالب کا ذہنی رویہ اور فنی برتاؤ کو بھی قرار دیتے ہیں کہ یہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں کچھ اتنا مجددانہ اور اپنے عہد سے اتنا آگے تھا کہ ان کے زمانے کے لوگ بر وقت ان کے فکر و فن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔

شعر و سخن سے غالب کا مقصود قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی تھا۔ اسی لئے اقبال کی طرح ان کی زبان ہمیشہ خیالات و موضوع کی پابند ہوتی ہے۔ اسی بناء پر ڈاکٹر فرمان غالب کو خیال و فکر کے علاوہ زبان کے فنی برتاؤ یا ڈکشن کے لحاظ سے بھی غالب کے اپنے عہد اور مابعد کے سارے شاعروں سے الگ قرار دیتے ہوئے ان کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری شاعری کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے میں غالب کے ایک اور وصف پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی بھر دینے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس مقالے میں پہلے غالب کے چند اشعار کو بطور نمونہ درج کر کے پھر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان کی اہمیت کو اپنے نقطۂ نظر سے واضح کیا ہے۔

زبان و بیان کے ان تمام اوصاف کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر فرمان ان کو ثانوی درجے پر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو چیز غالب کو اردو غزل کا مجدد اعظم بناتی ہے اور جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نظر نہیں آتا، وہ ان کے فکر و خیال کی تازگی و ندرت ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے تیس (۳۰) سے زائد اشعار کو جن میں ایسے اشعار بھی ہیں جو نسخۂ حمیدیہ کی دین ہیں اور ان کے مروجہ دیوان میں نہیں ملتے، نقل کر کے، غالب کے تجدید فکر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ خیال بالکل درست ہے:

”جس نسبت سے ذہن انسانی آگے بڑھتا جائے گا اور نفسیات انسانی کی گرہیں انسان پر کھلتی جائیں گی، اسی نسبت سے غالب

اور کلامِ غالب کی مقبولیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا۔''(۱)

(۱۱)

''غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم'' تنقیدی نوعیت کا مقالہ ہے۔اس کتاب سے پہلے یہ مقالہ اسی عنوان سے ''نقوش'' لاہور کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں اور ''غالب کے طلسم معنی پر ایک نظر'' کے زیر عنوان ''نگار'' کے اکتوبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے اس دعوے کو تسلیم کیا ہے کہ ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب نے علم بیان و بدیع کی ساری لفظی و معنوی صنعتوں، حتیٰ کہ اردو شاعری کی بدنام ترین صنائع لفظی، ابہام و تناسب لفظی سے بھی جگہ جگہ کام لیا ہے مگر اس مہارت سے کہ کسی جگہ بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی لفظ یا ترکیب کو کسی خاص رعایت یا التزام کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کے لئے غالب کے اشعار کے حوالے دے کر ہر شعر کی صنعت کا الگ الگ بیان کیا ہے۔

اشعار کے حوالوں سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ لفظی و معنی صنعتیں اپنے اندر معنی کی بے پناہ وسعت رکھتی ہیں۔گنجینۂ معنی کا یہ انداز غالب کے ہاں کہیں شعر کے بعض ٹکڑوں میں ہے اور کہیں شعر کے مجموعی لہجے میں اور کہیں الفاظ کے ایسے ٹکڑے رکھ دیئے گئے ہیں کہ اشعار میں دو متضاد معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر فرمان نے غالب کے ہر طریقے اور ہر انداز کو واضح کیا ہے اور غالب کے ذو معنین اشعار سے بحث کرتے ہوئے مولانا حالی کا حوالہ دیا ہے کہ:

''ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۲۶۴

اس کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد اس میں ایک
دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے یہاں اشعار کا مفہوم الفاظ کی سطح پر نہیں بلکہ ان کی تہہ میں ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم ان کے الفاظ و تراکیب پر جس قدر غور کرتے جاتے ہیں، اسی قدر ان کی گرہیں ہم پر کھلتی جاتی ہیں اور معنی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں بیان کردہ موضوع یا خیال ایسا اچھوتا نہیں جس کی مثال اردو فارسی کے شعراء کے یہاں نہ ملتی ہو لیکن ایسے اشعار کے حوالے دے کر ڈاکٹر فرمان نے واضح کیا ہے کہ غالب نے انہیں جس قسم کی مثالوں اور استعاروں کے ذریعے پیش کیا ہے، وہ اردو میں بالکل نئی چیز ہے اور یہی غالب کا طرۂ امتیاز ہے البتہ اس کی ایجاز نویسی اور معنی زائی میں مقدرات کو بھی خاصا دخل ہے اور وہ اس سلسلے میں فکر و خیال کی جدت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے جملہ محاسن سے بھی کام لیتے ہیں۔

غالب کے ہاں گنجینۂ معنی کا ایک سبب صنعت تلمیح کا استعمال ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق تلمیحات نے ان کے کلام کو ایک جہاں معنی سے آشنا کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ دیوان غالب کے مطلع کو درج کرتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس مطلع سے تلمیحات کے استعمال کا تو پتہ چلتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ غالب نے تلمیحی روایات کو نئی سمتوں اور نئے معنوں سے آشنا کر کے تجدد کی راہ دکھائی ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے دیوان غالب سے چند اشعار کو تلمیحات کے زیر عنوان درج کیا ہے جن سے ان اشعار میں معنوی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

غالب کے کلام کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے میں مزید صنعتوں کا حوالہ دیتے ہوئے

۱۔ ''یادگار غالب''

ڈاکٹر فرمان فتحپوری سہل ممتنع کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور ان کے کلام کو انہی کے شعر کا مصداق دیتے ہیں ۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزمایایا

اور سہل ممتنع کی اہمیت کو خود غالب کی زبان سے بیان کرتے ہیں کہ:

''سہل ممتنع کمال حسن کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔''(۱)

چنانچہ اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے اس دعویٰ کو کہ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

حق بجانب قرار دیتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''غالب نے اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے میں علم بیان و بدیع کے جملہ محاسن اور زبان و بیان کے سارے رموز و نکات سے کام لیا ہے۔''(۲)

(۱۲)

''غالب، شاعر امروز و فردا'' کا بارہواں مقالہ ''غالب کے مقطعے'' کے زیر عنوان ہے۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ ساقی (کراچی) کے اکتوبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس لحاظ سے اس مضمون کو غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری ہی کی ابتدائی نگارشات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

تنقیدی نوعیت کے اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان شاعری میں مقطع کی اصطلاح کو بیان کرتے ہیں کہ ''یہ غزل کے اس آخری شعر کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔

۱۔ خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر، ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۲۹۲

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۲۸۴

علاوہ ازیں وہ مقطع کے رواج کو فارسی کا تتبع قرار دیتے ہوئے اس کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو فارسی زبان میں مطلع و مقطع کی اہمیت یوں ہے کہ اس کے بغیر غزل، صوری اعتبار سے مکمل نہیں ہوتی۔''(۱)

بظاہر مطلع و مقطع کہنے میں کوئی دشواری معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر مطلع و مقطع سے عاری غزلیں دیکھنے میں نہ آتیں۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق یہ دشواری خارجی نہیں معنوی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹسٹ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے آرٹ کا تکملہ ایسا دلکش و نظر گیر ہو جو نہ صرف یہ کہ آرٹ کے جملہ محاسن کو بہ یک نظر مجلّی کر دے بلکہ اس میں کوئی خامی رہ گئی ہو تو اس کی بھی پردہ پوشی کر سکے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر فرمان مطلع کے مقابلے میں مقطع کی آرائش کے اہتمام کو زیادہ ضروری اور اہم خیال کرتے ہیں کیونکہ مقطع کمزور ترین غزل کے لئے آخری لحات میں تنکے کا سہارا ثابت ہوتا ہے۔

تخلص کا التزام اعلیٰ مقطع کی راہ میں حائل ہوتا ہے لیکن اس دشواری کے باوجود ڈاکٹر فرمان ''دیوان غالب'' کو دوسرے شعراء کے دیوان پر اس بناء پر ترجیح دیتے ہیں کہ

''ان کے مقطع، جدت خیال و ندرت اسلوب ہی کے حامل نہیں بلکہ غزل کے درمیانی اشعار سے بھی زیادہ خوبصورت و بلیغ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو قبول عام غالب کے مقطعوں کو نصیب ہوا، وہ کسی دوسرے کے مقطعوں کو میسر نہ آیا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے مقطعوں کو دو خاص گردہوں میں تقسیم کر کے اس کا مطالعہ کیا ہے اور بطور مثال مقطعوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان میں ایک قسم وہ ہے جس میں شعریت اور معنی آفرینی کی بجائے بے کیف واقعہ نگاری اور قافیہ پیمائی ملتی ہے اور

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص، ۲۸۵

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص، ۲۸۷

اس قسم کے مقطعوں کا حقائق سے بالعموم کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان میں تعلی زیادہ، واقعیت کم ہوتی ہے۔ دوسری قسم کے مقطع تغزل اور شعری محاسن سے بھرپور ہیں اور فکروفن کے لحاظ سے غزل کی جان نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے مقطعوں کی مختلف نوعیت کو بیان کر کے غالب کے مقطعوں کی انفرادیت اور مقبولیت کو اجاگر کیا ہے جو ہماری تحریر وتقریر میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے زیرِ نظر مقالہ میں مومنؔ، فانیؔ، میرؔ، حسرتؔ، شیفتہؔ وغیرہ کے حوالے دیئے ہیں، ساتھ ہی ان شعراء کے قابل غور قطعوں کو بھی درج کیا ہے لیکن ایسے مقطعوں کی تعداد دوسرے شعراء کے ہاں کمتر جب کہ غالب کے ہاں بیشتر ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے ایسے مقطعوں کا حوالہ دیا ہے جن میں فکروفن اور زبان و بیان کے محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کی اہمیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے۔

> ''ان مقطعوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس طرح کہا گیا ہے وہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' کے مصداق ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو غالب کے مقطعوں کو مقبول عام وخاص بناتی ہے۔''(۱)

(۱۳)

''غالب کی یادگار قائم کرنے کے اولین تجویز'' فرمان صاحب کی زیرِ نظر تصنیف کا تیرہواں مقالہ ہے۔ اس کتاب کا حصہ بننے سے پہلے یہ مقالہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (علی گڑھ) کے دسمبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں ''قومی زبان'' (کراچی) کی مارچ ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں اور سہ ماہی ''ہندوستانی ادب'' (حیدرآباد) کے ''غالب نمبر'' جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ تحقیقی

۱۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ص، ۳۰۱

نوعیت کا حامل ہے۔

اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان، غالب کی عظمت اور وجاہت کی عکاسی کی اولین تجویز کا حوالہ دیتے ہوئے غالب شناسی کے مستقبل سے پرامید نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے اس کتاب میں ایک اور مقالے میں بھی اس طرف توجہ دلائی ہے کہ غالب کو اپنے عہد میں نامقبولیت کے باوجود ''ستائش وصلہ کی تمنا'' کبھی نہ رہی کیونکہ انہیں اپنے فن کی توانائی اور تازگی پر اعتماد تھا۔(۱) یہی وجہ ہے کہ وہ کامل اعتماد و یقین کے ساتھ اعلان کرتے رہے کہ آج نہ سہی، کل سہی، بہرحال وہ شہرت کی چوٹیاں ضرور سر کریں گے اور ان کا یہ دعویٰ درست بھی ثابت ہوا۔مولانا الطاف حسین حالی کی ''یادگار غالب'' اور عبدالرحمٰن بجنوری کی ''محاسن کلام غالب'' وہ معرکۃ الآراء تصانیف ہیں جنہوں نے غالب شناسی کے شعلے کو ہوا دی اور پھر یہ آگ جنگل کی آگ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جس اہتمام سے مختلف انواع کی تحریروں میں غالب کو یاد کیا جاتا ہے اور اس کے درجے کو بڑھایا جاتا ہے، کسی دوسرے اردو شاعر کو اس طرح یاد نہیں کیا جاتا۔ غالب کی اسی عظمت اور مقبولیت کے باعث ۱۹۶۹ء میں ان کی صد سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا گیا۔

ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''یہ برسی نہ صرف اپنی نوعیت کی پہلی عظیم و ہمہ گیر ادبی تقریب ہوگی، بلکہ ہماری ادبی تاریخ میں ایک یادگار واقعے کی حیثیت رکھے گی۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان کے مطابق اس تقریب کا مقصد غالب کو ان کی شخصیت اور کلام کے حوالے سے ازسرنو زندہ رکھنا ہے۔چنانچہ وہ یہاں غالب کو روشناس کروانے کے نئے منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز کا تعین کرتے ہوئے

۱۔ ''غالب اور اقبال (۲)''، مشمولہ۔ غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۱۴۷

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا''، ص ۳۰۴

بتاتے ہیں کہ غالب کی وفات کے دوسرے مہینے ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ تجویز غالب ہی کے ایک شاگرد مردان علی خاں رعنا کی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے رعنا کے نام غالب کے دو خطوط درج کئے ہیں (۱) لیکن حالات زندگی پر روشنی نہیں ڈال سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری مالک رام کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ (۲) مردان علی خاں رعنا کی اصل تجویز جو اودھ اخبار میں چھپی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق اس تک ہماری رسائی نہیں لیکن گارساں دتاسی نے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کر کے اپنی تاریخ ہندوستان میں محفوظ کرلیا ہے اور اسی کا اردو ترجمہ، زیر نظر مقالہ میں ڈاکٹر فرمان نے نقل کیا ہے۔

مردان علی خاں رعنا کی تجویز یہ تھی کہ غالب کی یادگار:

> '' خالص ادبی، یعنی ایک کتاب کی صورت میں ہو، جس کے پہلے حصے میں ان تاریخی واقعات کا اردو فارسی میں مرتب کیا جائے جن کا غالب کی ذات سے گہرا تعلق ہو۔۔۔ دوسرے حصے میں ان نظموں اور مضامین کو جمع کیا جائے جو ان کے شاگردوں نے لکھے ہیں۔ اس کے بعد ان قطعات، تاریخ اور مرثیوں کو مرتب کیا جائے جو ان کے شاگردوں نے ان کی وفات پر کہے۔ اس کتاب میں ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہونا چاہئے۔۔۔۔'' (۳)

اس تجویز کے خوشگوار اثرات مالک رام کی '' تلامذہ غالب '' کی صورت میں منظر عام پر آئے لیکن اس میں کئی پہلو تشنہ ہیں البتہ اکبر علی خاں کی '' غالبیہ '' اور بعض دوسری

۱۔ '' خطوط غالب '' حصہ دوم، ص ۳۵۱، مطبوعہ کتاب منزل، لاہور، طبع اول

۲۔ '' تلامذہ غالب ''، مرتبہ مالک رام مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف، نکودر، طبع اول، ص ۲۸۴

۳۔ '' غالب، شاعر امروز و فردا۔ '' ص ۳۰۷، ۳۰۸

کتابوں کی اشاعت کی خبر سے ڈاکٹر فرمان پرامید ہیں کہ غالب کے محققین اور پرستاران کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان کی زندگی اور فن کے سلسلے میں بہت سی اہم باتوں اور گم شدہ کڑیوں کو سامنے لانے کی طرف بھی توجہ دیں گے اور سو سال پہلے پیش کی جانے والی تجویز اپنی تکمیل کو پہنچے گی۔

(۱۴)

''غالب کے حالات میں پہلا مضمون'' ڈاکٹر فرمان کی غالب پر زیر نظر تصنیف کا چودھواں (۱۴) مقالہ ہے۔ اس سے پہلے یہ ''غالب کے حالات میں پہلا مضمون (وفات کے بعد)'' کے عنوان سے ''العلم'' (کراچی) کے جنوری تا جون ۱۹۶۹ء کے ''غالب نمبر'' میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی نوعیت کا ہے، اس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کی وفات کے بعد ان کے حالات وکلام کے بارے میں سب سے پہلے کس نے یا کن لوگوں نے لکھا، اس سے متعلق اپنی تحقیقی بصیرت سے کچھ معلومات کو یکجا کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسعود حسن رضوی ادیب کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جو ''غالب کے حالات میں پہلا مضمون'' کے عنوان سے ہے لیکن اس کے مطالعے سے ڈاکٹر فرمان کے بقول یہ واضح ہوتا ہے کہ مسعود حسن ادیب نے غالب کی وفات کے بعد لکھے جانے والے مضمون کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے پہلا مضمون اسے قرار دیا ہے جو ''ذخیرہ بال گوبند'' نامی ماہوار رسالے میں شائع ہوا، اس کا عنوان ''مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب ونوشہ'' ہے۔ یہ مضمون اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں شائع ہوا اور غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے چند روز بعد لکھا گیا۔ (۱) اس کے علاوہ اس مقالہ میں ڈاکٹر فرمان نے اسی نوعیت کے اور مضمون کو غالبیات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی خیال کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ یہ مضمون بھی غالب کی وفات کے فوراً بعد ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار، لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اودھ اخبار تک رسائی نہ ہونے کے

۱۔ ''احوال غالب''، ص ۱۹ مرتبہ مختار الدین احمد آرزو، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۵۳ء

باعث ڈاکٹر فرمان نے اس مضمون کو ''تاریخ ادب ہندوستانی'' میں گارساں دتاسی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس مضمون میں غالب کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین ہے۔ غالب کا حسب نسب، عادت و اطوار، ان کی سات (۷) تصانیف اور ان کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ ان تصانیف میں فارسی دیوان، مہر نیمروز، دستنبو، پنج آہنگ، قاطع برہان، ایک ریختہ دیوان اور اردوئے معلیٰ شامل ہیں اور غالب کی آخری عمر کے بارے میں لکھا گیا کہ آخر دم تک ان کے ہوش وحواس بجا رہے، صرف سنتے کم تھے اور جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ دیا کرتے تھے۔(۱)

گارساں دتاسی کے اصل مضمون کو بالاختصار نقل کیا، اس لئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق اصل مضمون کے بارے میں صحیح اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب اودھ اخبار کی فائلیں ہمارے سامنے ہوں۔ اس لئے وہ اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس مضمون کو اصل صورت میں شائع کرے جس سے ممکن ہے کہ غالب کے متعلق نئی معلومات میں اضافہ ہو۔

(۱۵)

''غالب، شاعر امروز و فردا'' کا آخری مقالہ بعنوان ''اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے'' اس سے پہلے ۱۹۶۹ء میں ایک کتاب ''غالب، ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' اور ۱۹۶۹ء میں ہی اسی عنوان سے راوی (لاہور) کے ''غالب نمبر'' میں شائع ہوا ہے اور اس مقالہ کا طویل حصہ اس کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان نے غالب پر اپنی دوسری کتاب ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے مقدمے بعنوان ''کتاب سے پہلے'' میں بھی شامل کیا۔

ڈاکٹر فرمان کا یہ مقالہ تنقیدی نوعیت کا ہے جو ''مجلس یادگار غالب'' (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے ایماء پر ۱۹۶۹ء میں لکھا، اس میں کلام غالب کی اہمیت اور اس کے

۱۔ ''تاریخ ادب ہندوستانی'' اردو ترجمہ قلمی جلد دوم، مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

عنوانات کی انفرادیت کے پیش نظر ذہنی، فکری اور جذباتی زندگی پر اس کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ غالب کے اس دعوے پر کہ اگر سخن فہمی کا شعور عام ہو جائے تو دیوان غالب شہرت کی بے پناہ بلندیوں پر پہنچ جائے گا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس وقت ایمان لے آئے تھے جب:

''مجنوں لام الف لکھتا ہے دیوار دبستاں پر''

اور پھر غالب سے اپنے تعلق کی گہرائی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جیسے جیسے شعر وسخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہنما اور مشکل کشا بن گئے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان دوسرے شعراء پر غالب کو اس بنا پر ترجیح دیتے ہیں کہ ان شعراء کے ہاں پڑھنے کو تو سب کچھ ہے لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت اترتی ہے جب غالب کے مختلف النوع اشعار ہمارے سامنے آتے ہیں جو ذوق کی تشفی اور ذہن کی سیرابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ میں ڈاکٹر فرمان نے ''فلسفہ جدلیات، زندگی و ادب کا رشتہ، محاکات شعری، سرمایہ دارانہ سختیاں، زندگی کی حقیقت، طنز وظرافت، ایجاز واختصار اور گنجینۂ معنی کا طلسم اور اس قسم کے اور کئی موضوعات و عنوانات کے تحت غالب کی عظمت اور طرز خاص کی حلاوت وحذافت کو اجاگر کیا ہے اور اشعار کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کو قابل اعتبار بنایا ہے۔ مثال کے طور پر لکھتے ہیں:

''زندگی کی گہما گہمی اور کار جہاں کی درازی کی خبر دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا سچا لطف اس شعر کے بعد نصیب ہوا:

۱۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ص ۳۲۰

خون ہو کے جگر، آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک
رہنے دے ابھی یاں مجھے کام بہت ہے (۱)

اسی قسم کی مثالوں سے ڈاکٹر فرمان نے کلام غالب سے اپنی عقیدت اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے اور کلام غالب سے جس طرح انہوں نے فیض حاصل کیا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''غالب اور کلام غالب نے فکر وفن کے ان گنت نکتے سمجھائے ہیں، ذہن کے نہ جانے کتنے گوشوں کو منور کیا ہے، اور:
''چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا'' کی معرفت، میری فکری اور جذباتی زندگی کو کسی ایک عنوان سے نہیں ہزار عنوان سے متاثر کیا ہے۔'' (۲)

یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر فرمان تو شاعری کی اصل حقیقت تک رسائی ہی غالب کی معرفت حاصل کرتے ہیں کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے، حمزہ کا قصہ نہیں دل گداختہ کی تفسیر ہے۔ جزو میں کل کی نمائش ہے اور بادہ و ساغر کا تذکرہ نہیں بلکہ مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری غالب کے ان تمام احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ غالب سے محبت اور عقیدت کا حق تا حال ادا نہیں کر سکے۔

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۳۲۲

۲۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ص ۳۲۷

چھٹا باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا دوسرا مجموعہ:

'تمنّا کا دوسرا قدم' اور غالب

(ایک جائزہ)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اعلیٰ درجے کے مُحقق بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ حالانکہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مُحقق ایک اچھا نقّاد نہیں ہوتا، اسی طرح نقّاد بھی بہت اچھا مُحقق نہیں بن پاتا۔ لیکن فرمان صاحب نے دونوں میدانوں میں اختصاص پیدا کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اردو شاعری میں خاصا کام کیا ہے اور کلاسیکی ادیبوں اور شاعروں میں غالب پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم

تمنا کا دوسرا قدم اور غالب

تنقید و تحقیقِ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے آٹھ متفرق مقالات پر مشتمل، ان کی دوسری تصنیف ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے عنوان سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ناشر ''حلقہ نیاز و نگار کراچی'' ہیں۔ اس کا مقدمہ ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے ہے۔ اس مقدمے کا کچھ حصہ اس سے بہت پہلے ڈاکٹر فرمان کے ایک مقالے بعنوان ''اے کاش کبھی معرضِ اظہار میں آوے'' میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ ان کی غالب پر پہلی کتاب ''غالب، شاعر امروز و فردا'' میں بھی شامل ہے(۱) اور اس سے پہلے یہ مقالہ ۱۹۶۹ء میں ''غالب، ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی چھپا۔ یہ کتاب ۱۳۶ صفحات پر مبنی ہے۔

اس کتاب کے اکثر مقالے نئے ہیں البتہ ایک دو مقالات کو ''غالب، شاعر امروز و فردا'' سے بھی قندِ مکرر کے طور پر شامل کتاب کیا گیا ہے جس میں اس تصنیف کے مقالے ''غالب کا اسلوب طنز و ظرافت'' کا نام لیا جا سکتا ہے جو ''غالب، شاعر امروز و فردا'' میں ''غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو'' کے نام سے ہے البتہ تازہ کتاب میں اشاعت کی غرض سے اس کے کچھ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں۔

دوسرا مقالہ جو قندِ مکرر کے طور پر ہے، وہ اس کتاب میں ''غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا'' کے عنوان سے ہے جبکہ پہلی کتاب سے اس کا عنوان ''غالب، شاعر امروز و فردا'' تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور مقالے ''کلام غالب میں استفہام'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ عنوان کے اعتبار سے ہی ان کی پہلی کتاب میں شامل مقالے سے نہیں ملتا بلکہ بحث میں بھی انہیں نکات کا بیان کیا گیا ہے البتہ اس مقالے میں غالب کے استفہامیہ لب و لہجہ کے

۱۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' (ص ۳۱۹۔۳۲۷)

پیش نظر آخر میں کچھ اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان کی اس تصنیف میں شامل کچھ مقالے تنقیدی، کچھ تحقیقی اور کچھ نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں جنہیں الگ الگ رکھنا چاہیں تو یہ صورت بنتی ہے۔

تنقیدی مقالے

۱۔ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف (ص ۲۶۔۵۱)

۲۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر (ص ۵۲۔۶۹)

۳۔ کلامِ غالب میں استفہام (ص ۱۲۴۔۱۳۳)

۴۔ غالب کا اسلوب طنز و ظرافت (ص ۱۱۳۔۱۲۳)

۵۔ غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا (۹۷۔۱۱۲)

تحقیقی مقالے

۱۔ کیا دیوان غالب ''نسخہ امروہیہ'' واقعی جعلی ہے؟ (ص ۸۲۔۹۶)

نیم تنقیدی و نیم تحقیقی مقالے

۱۔ کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کی تکرار بطور استعارۂ فلسفہ آثار (ص ۱۔۲۵)

۲۔ ہم عصر و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب (ص ۷۰۔۸۳)

ان مقالات کے علاوہ اس کتاب کے آخر میں ''نسخۂ حمیدیہ'' سے چند اشعار'' کے عنوان سے دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ سے ۱۲۹ اشعار کو درج کیا گیا ہے۔

غالب کے فکر و فن کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ دوسرا مجموعۂ مقالات ان کی پہلی کتاب ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے پچیس (۲۵) برس بعد شائع ہوا لیکن اس بات کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ یہ طویل عرصہ دوسری علمی و ادبی مصروفیات کے علاوہ غالب اور غالبیات کو سینے سے لگانے رہنے میں گزرا۔

انہوں نے اپنے دیگر مطالعات پر مطالعۂ غالب کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ چنانچہ اس تعلق کا عملی ثبوت ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔

اس تصنیف میں بھی ایسے مقالے شامل ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادی

مقام رکھتے ہیں اور ڈاکٹر فرمان کے شعور و لاشعور کا حاصل ہیں۔ ان میں اس کتاب کا مضمون اول ''کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارۂ فلسفہ آثار'' قابل ذکر ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''تنقید غالب کے سلسلے میں میرے اس مضمون کی حیثیت وہی ہے جو میرے ایک پرانے مضمون ''کلام غالب میں استفہام'' کی تھی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کو پانے اس کی لم تک پہنچنے کی لئے یہاں ان مقالات کا الگ الگ تجزیہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ''کتاب کیسی ہے؟'' اس کا اپنی بساط کے مطابق جواب فراہم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ کتاب میں شامل مقالات پر تجزیاتی نظر ڈالی جائے۔

(۱)

''کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کی تکرار بطور استعارۂ فلسفہ آثار'' ڈاکٹر فرمان کی تصنیف ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کا پہلا مقالہ ہے۔ اس کتاب سے پہلے یہ مقالہ اسی عنوان سے ''اوراق'' لاہور کے خاص نمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ ''نیم تنقیدی و نیم تحقیقی'' نوعیت کا حامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر فرمان نے اپنی تنقیدی و تحقیقی بصیرت سے بہت خوب کام لیا ہے۔ غالب کے کلام کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی کا حامل ہے۔ اس کے ذہن کی گرہ کشائی کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان نے کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک لفظ ''تمنا'' کا استعمال غالب کے فکر و فن کے بعض اہم نکتوں اور بھاری ردیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اسے غالب کی سرشتِ مزاج کا خاص پہلو کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''تمنا'' کا لفظ محض شعری حسن کا باعث نہیں بنتا بلکہ معنوی اثر آفرینی اور فلسفہ آثار کا بھی استعارہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری لفظ ''تمنا'' کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے ''حرفِ تمنا'' کو فلسفہ و شعر دونوں کی حقیقت سے موسوم کیا ہے لیکن

غالب کے ہاں اس لفظ کی اہمیت اور کرشمہ سازی کی اہمیت کچھ اس لحاظ سے بھی ہے کہ:

> ''اس لفظ کے ذریعے غالب کے ذہن کی بعض ناکشودہ گرہیں کھلتی ہیں اور یہ گرہیں زندگی کے بارے میں ان کے طرزِ فکر سے متعلق ہیں۔''(۱)

غالب نے اپنے کلام میں ''تمنا'' کا لفظ کثرت سے استعمال کیا ہے اور اس لفظ کی مناسبت سے بہت نادر فارسی تراکیب ایجاد کر کے انہیں اردو و فارسی دونوں میں مستعمل رکھا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ان ترکیبوں کی معنوی یکسانی غالب کے ذہن کے بعض سربستہ راز و منتشر اجزاء کو واشگاف کر کے ایک کل کی صورت میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہ کلیت غالب کو اپنے عہد کا ایک بڑا تجزیہ پسند بناتی ہے۔ غالب کی فکر کا یہ خاص پہلو لفظ ''تمنا'' کے علاوہ غالب کے دوسرے اشعار میں بھی نمایاں ہوا ہے لیکن غالب کے سرکش و باغیانہ ذہن اور اضطراب کی اصل صورت ڈاکٹر فرمان کے نزدیک انہیں اشعار میں نمایاں ہے جہاں لفظ ''تمنا'' کا وسیلہ استعمال کیا گیا ہے۔ ''تمنا'' کے لفظ کا تکرار کے ساتھ استعمال ڈاکٹر فرمان کے مطابق پہلی مرتبہ ان کی اس مشہور غزل میں ہوا جس کا مطلع یہ ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ڈاکٹر فرمان نے اس غزل کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مختلف اشعار میں لفظ ''تمنا'' کی صورتوں اور مفہوم کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تمنا کی شکست یا نامرادی غالب کے لئے وجۂ دل شکنی نہیں بلکہ باعث حوصلہ مندی ہے جو آرزو مندی کی تڑپ کو کچھ اور بڑھا دیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نہ صرف غالب کے مروجہ دیوان کی غزلیں اور اشعار بطور حوالہ دے کر ان میں لفظ ''تمنا'' کے استعمال کی مختلف صورتوں کی

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص ۳

وضاحت کی ہے بلکہ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ سے بھی اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اشعار درج کر کے ان میں تمنا کے فلسفہ طراز نکتہ کو واضح کیا ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ تمنا کے لفظ کا استعمال کم و بیش ایک ہی معنی و رنگ میں غالب کے یہاں کئی جگہوں میں ہوا ہے جن میں متداول دیوان اور دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ دونوں شامل ہیں۔

غالب کے کلام میں ''تمنا'' کا لفظ فطرتِ انسانی کے اس ذوقِ طلب اور شوقِ بے پایاں کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی کو متحرک و بامعنی بنائے رکھتا ہے۔ اقبال کے یہاں بھی یہی تمنا شوق و آرزو کا مفہوم رکھتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اسی مشترک اندازِ نظر اور رخِ فکر کی بدولت اقبال کو غالب کے بہت قریب پاتے ہیں اور اسی بناء پر اقبال فکر و شعر کے سارے سفر میں غالب کو محترم جانتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے اقبال اور غالب دونوں کے اشعار میں انسان کے وجود کے اثبات سے متعلق سوالات کو بیان کیا ہے۔ غالب کے یہاں یہ سوالات بظاہر منتشر ہیں لیکن لفظ ''تمنا'' کے آئینے میں یہ باہم مربوط نظر آتے ہیں۔ یہ ربط اور تسلسل زندگی کے بارے میں غالب کے مثبت اندازِ فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے شاعری اور زندگی کے تعلق کے حوالے سے مجنوں گورکھپوری کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے کہ زندگی بلا، جنجال اور شریر قوتوں کا اندھیر ہی سہی لیکن ہم اسے اپنے لئے گوارا بنا سکتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اس خیال میں غالب کو اپنا ہم نوا خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان، مجنوں گورکھپوری کے اس انداز فکر کو اپنے خیالات کی تلخیص قرار دیتے ہیں کہ فکر غالب میں لفظ ''تمنا'' استعارۂ فلسفہ آثار ہے اور ڈاکٹر فرمان کے مطابق اردو شاعری میں غالب کے علاوہ صرف اقبال کی زندگی اور شاعری مجنوں گورکھپوری کے خیالات کی مترادف ہے۔

غالب کے ذہن اور اس کی شخصیت کی تفہیم کے لئے کلام غالب میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ اور تراکیب سے مدد لی جاتی رہی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے ایک قابل قدر مقالے ''کلام غالب میں استفہام'' کے زیرِ عنوان ۱۹۵۲ء میں کلمات

استفہام کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ غالب کے بیان میں اگرچہ کوئی مربوط نظامِ فکر نہیں ملتا لیکن ان کا ذہن بہر حال فلسفیانہ تھا اور اس کی توجیہہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کیوں، کیا، کیسے، کے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اس مقالے کے اکتالیس (۴۱) سال بعد ڈاکٹر فرمان کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کے مطالعے کی مدد سے غالب کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''غالب اصطلاحی مفہوم میں فلسفی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، لیکن فلسفیانہ ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حیات افروز نظامِ فکر و فلسفہ بھی رکھتے تھے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس ضمن میں مولانا روم اور علامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ لفظ ''تمنا'' کا استعارہ، اردو میں فکرِ تازہ کا پہلا اشارہ ہے۔

(۲)

''غالب کی شاعری اور مسائل تصوف'' زیرِ نظر تصنیف کا دوسرا مقالہ ہے۔ سب سے پہلے یہ مقالہ اسی عنوان کے تحت سالنامہ ''صریر'' کے جون جولائی ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ تنقیدی نوعیت کا ہے۔

غالب کا اپنی مجموعی شاعری سے متعلق ادعات کا حوالہ دیتے ہوئے اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کی شاعری کے ایک خاص موضوع یعنی مسائل تصوف کے متعلق ان کے طرزِ بیان کی یکتائی کے دعویٰ کا تجزیہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے بتایا ہے کہ اردو میں جہاں ولی دکنی، خواجہ میر درد، مظہر جان جاناں، میر تقی میر، آتش لکھنوی اور اصغر گونڈوی وغیرہ کی شاعری کا فنی کمال عموماً تصوف کے موضوعات کی ترجمانی میں رونما ہوا ہے۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں تصوف کی یہ نمود بحیثیت مجموعی بے کیف و بے اثر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا یہ دعویٰ

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص ۲۴

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

شاعری کے پیش نظر حقیقت پر مبنی نہیں۔

ڈاکٹر فرمان کے رائے میں غالب نے مسائل تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع ضرور بنایا ہے لیکن یہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں وہ گہرائی اور تہہ داری نہیں ملتی جو غالب کی شاعرانہ عظمت کا طرۂ امتیاز ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے دنیا کی بے ثباتی پر ''وحدت الوجود'' کے عقیدے کے حوالے سے غالب کے اشعار اور پھر ان کے ہم خیال اور مترادف موضوعات کے حامل دوسرے شعراء مثلاً ولی، میر، درد، وغیرہ کے اشعار نقل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ غالب کے اشعار میں سچے صوفی شعراء والی کیفیت نہیں ملتی اور یہی صورت غالب کی انا پسندی سے متعلق اشعار کی ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں:

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کے زمانے میں تصوف کے مسائل کو شاعری میں جگہ دینے کا رواج عام تھا۔ اسی بناء پر غالب نے بھی تصوف کے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی لیکن بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

''اس میں آمد سے زیادہ آورد کا غلبہ ہوتا تھا یا پھر ذہنی درزش اور شعوری فلسفہ طرازی کا۔''(۱)

غالب کے شاگرد و پرستار مولانا حالی نے ''یادگار غالب'' میں غالب کی تصوف کی پسندی کی تائید میں لکھا:

''علم تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، ص ۳۷

اور رسالے ان کے مطالعے سے گزرے ہیں۔"(۱)

لیکن ڈاکٹر فرمان اس بیان کو غالب کے اقوال پر مبنی قرار دیتے ہیں جنہیں حالی جیسے شریف النفس سیرت نگار نے اپنے لفظوں میں دہرایا ہے۔

غالب کے کمال میں تصوف کی نوعیت سے متعلق ڈاکٹر فرمان نے علامہ نیاز فتحپوری (۲)، شیخ محمد اکرام (۳)، ڈاکٹر شوکت سبزواری (۴) اور ڈاکٹر وزیر آغا (۵) کے بیانات درج کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اگر غالب بادہ خوار نہ ہوتے تو بھی انہیں بلند مرتبہ صوفی یا ولی تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان نے اس نکتے پر بھی بحث کی ہے کہ غالب کے ندرتِ فکر اور تخیل کے حامل اشعار کو بعض حضرات نے اس طرح سمجھا اور سمجھایا ہے کہ غالب ایک صوفی شاعر معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن درحقیقت غالب کے ان اشعار کی کشش متصوفانہ افکار کی بجائے غالب کی منطقیانہ سوچ اور جدت پسند اسلوب کی بدولت ہے اور یہ اشعار تصوف کے مفہوم میں بے جان ہیں۔ ڈاکٹر فرمان نے غالب کے نو (۹) اشعار کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس نوعیت کے اشعار میں ڈاکٹر فرمان کے مطابق وہ شاعرانہ عمق و گہرائی نہیں جو غالب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کے جواز میں وہ غالب کے مذکورہ اشعار

۱۔ "یادگارِ غالب"، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۸۸

۲۔ نگار، لکھنؤ، غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۱ء، ص ۵۷

۳۔ حکیم فرزانہ، ص ۱۹۸

۴۔ فلسفہ کلام غالب، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۲

۵۔ اوراق بابت جون۔ جولائی ۱۹۹۲ء

کے حوالے سے نیاز فتحپوری (۱) کی رائے کو بیان کرتے ہوئے غالب کے اس قسم کے متصوفانہ افکار کے حامل اشعار کو ذہنی ورزش یا معمہ حل کرنے کی مشق کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

غالب کے اندازِ فکر کو صوفیانہ مسلک سے یکسر مختلف گردانتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے اشعار اور خطوط میں ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جو ایک سچے صوفی شاعر کی روش کے برخلاف ہیں، مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

انہی حقائق کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان نے یہ واضح کیا کہ بادہ خواری کے علاوہ بھی غالب کے بیشتر مشاغل مسلک تصوف کے منافی تھے۔ وہ زمانے کے مزاج کے مطابق اپنی رائے تبدیل کرتے رہتے چنانچہ ڈاکٹر فرمان نے غالب کی مصلحت اندیشی اور عافیت بینی سے متعلق اس مقالے میں چار (۴) مثالوں کو بطور حوالہ پیش کیا ہے، مثلاً جب لوگوں نے غالب کو بے استاد کہنا شروع کیا تو ملاّ عبدالصمد کے نام سے ایک استاد سامنے لے آئے، پھر خود ہی اس کی تردید اس طور کردی:

''مجھ کو مبدا فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبدالصمد محض فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لئے ''ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔'' (۲)

زیر نظر مقالے میں پیش کی گئی مثالوں اور اس قسم کی مزید مثالوں کو ڈاکٹر فرمان نے اپنے ۱۹۶۱ء کے ایک مضمون ''غالب کا نفسیاتی مطالعہ'' میں وضاحت سے درج کیا ہے۔ یہ مقالہ غالب پر ان کی پہلی تصنیف ''غالب، شاعر امروز و فردا'' میں بھی شامل ہے۔

۱۔ ''غالب، فن اور شخصیت''، ص ۶۱، مطبوعہ اردو اکادمی سندھ کراچی، ۱۹۸۷

۲۔ ''یادگار غالب''، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے فلسفہ کلام پر ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱) کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ:

> ''غالب نے مسائل تصوف کے بیان کے باب میں جو دعویٰ کیا ہے، وہ محض دعویٰ ہے، نہ تو ان کی اردو شاعری سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ ان کی زندگی کے معمولات سے۔'' (۲)

زیرِ نظر مقالے میں اسی نکتے کی دلائل سے وضاحت کی گئی ہے کہ غالب کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ مقام مسائل تصوف کے بیان کی بدولت نہیں بلکہ وہ صلح جوئی و گوشہ نشینی اور وہ توکل و درویشی، جس کا تعلق تصوف سے ہے، غالب کے یہاں ملنا مشکل ہے اور ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز درحقیقت ذہن و فکر انسانی کی غیر معمولی دسترس کے امکان میں پنہاں ہے۔

(۳)

''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کا تیسرا مقالہ ''غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر'' کے عنوان سے ہے۔ یہ پاکستان آرٹس کونسل آف پاکستان کی ادبی کمیٹی کا دیا ہوا موضوع ہے جس پر ۱۵ فروری ۱۹۹۳ء کو ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس کے بعد یہ مقالہ اسی عنوان سے ''تمثال'' کراچی کی جون ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ تنقیدی نوعیت کا حامل ہے۔

غالب کا اثر صرف جدید اردو شاعری ہی پر نہیں بلکہ سارے اردو ادب پر نمایاں ہے البتہ موضوع کی مناسبت اور حدود میں ڈاکٹر فرمان نے صرف ''جدید اردو شاعری پر'' غالب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

۱۔ ''فلسفہ کلام غالب'' ص ۴۴

۲۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص ۴۷

ڈاکٹر فرمان کے مطابق جدید اردو شاعری کی ابتدا اگر غالب کی وفات کے فوراً بعد سے شمار کی جائے اور آزاد اور حالی کو اس کے بانیوں میں شامل رکھا جائے تو دونوں غالب کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔ آزاد نے اگرچہ اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کو غالب پر ترجیح دی لیکن وہ بھی ''شہرت عام و بقائے دوام'' کے تحت غالب کی عظمت کے اس لحاظ سے معترف ہیں کہ غالب ایک نیا طرزِ سخن لے کر آئے اور حالی تو براہ راست غالب کے شاگرد اور غالب کے اولین رمز شناس وقدر دان تھے۔

بعض حضرات فکری سطح پر جدید اردو شاعری کے بانی آزاد اور حالی کی بجائے اقبال کو خیال کرتے ہیں، اس صورت میں ڈاکٹر فرمان کے مطابق:

> ''اقبال کے فکر و فن پر جتنا اثر غالب کا ہے، اردو کے کسی اور شاعر کا نہیں ہے۔''(۱)

غالب اور اقبال کی معنوی ہم آہنگی پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان، شیخ عبدالقادر کی رائے سے متفق ہیں:

> ''اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ۔۔۔۔ دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان نے غالب اور اقبال کے فکر و فن کی یکسانیت کے جواز میں ان دونوں شاعروں کے تقابلی مطالعے کے لئے اشعار کے حوالے دیئے ہیں اور اپنے نقطۂ نگاہ کو واضح کیا ہے۔ علاوہ ازیں جگر کے عہد کی رندی شاعری، اصغر کا متصوفانہ لب ولہجہ، حسرت کے کلام میں فارسی تراکیب کی کثرت وندرت، فانی کی غزل کی معنوی گہرائی اور تہہ داری، یگانہ کی پوری شاعری ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اثرات کی حامل ہے۔ انہوں نے غالب کی غزل کی ردیف کو حسرت کی غزل کے بعض اشعار میں رکھ کر ان

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص ۵۴

۲۔ ''کلیات اقبال'' اردو اقبال اکیڈمی، پاکستان، لاہور، ص ۳۵

میں ہم آہنگی کو واضح کیا ہے۔

اسی طرح اگر جدید اردو شاعری کا آغاز ۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سمجھا جائے تو بھی اس زمانے کے شعراء میں موضوع و مواد کی جو رنگا رنگی اور طرز اظہار کی جو ہمہ جہتی نظر آتی ہے، وہ اس سے پہلے غالبؔ کے سوا کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ سب سے پہلے غالبؔ ہی نے ماضی پرستی سے انحراف، تتبع سے گریز اور جدید سے ہم آمیز ہونے کے چلن کو اردو میں رواج دیا ہے۔ اس نکتے کو ڈاکٹر فرمان نے غالب کے خطوط کے حوالے سے واضح کیا ہے اور غالب کے اس شعر:

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ سرمائے کی کثرت دزر و افراط زر کی لعنتوں کے حوالے سے ترقی پسند شعرا اور دوسرے شعراء میں بھی کوئی اور اس سے خوبصورت اور بہتر شعر نہیں نکال سکا۔

جدید اردو شاعری کے دو اہم نام ن، م راشد اور فیض احمد فیض نے بھی غالب کی تراکیب فارسی اور تمثالی پیکروں سے بقدر استعداد فائدہ اٹھایا اور ڈاکٹر فرمان کے مطابق دونوں کے کلام میں پیکر تراشی کی سج دھج غالب کی پیکر تراشی سے ملتی جلتی ہے۔ فیض نے تو اپنے ابتدائی مجموعہ کلام ''نقش فریادی''، ''کلیات فیض''، نسخہ ہائے وفا'' اور اپنے ایک اور مجموعے ''دست تہہ سنگ'' کے نام بھی غالب کے زیر اثر رکھے۔ ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مقالے میں غالب کے ان متعلقہ اشعار کو جن پر فیض نے اپنے مجموعوں کے نام رکھے ہیں، درج کر کے فیض پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فیض نے غالب کی زبان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، ان کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے، ان کے شعری سانچوں کو بھی آزمایا ہے اور ان کی زمین میں غزلیں بھی کہی ہیں۔'' (۱)

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص ۶۳

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے زیر نظر مقالے میں ہر دور کی شاعری پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعری پر بھی، جسے عموماً نئی شاعری یا جدید تر سے موسوم کیا گیا ہے، غالب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے ان اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے جن میں استعاروں، علامتوں، کنایوں اور تمثالوں کو استعمال کیا گیا، یہ واضح کیا ہے کہ ان اشعار کی مدد سے نئی شاعری یا جدید شاعری پر غالب کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جدید شاعری کی مابعدالطبیعاتی آواز لفظی پیکروں کے لحاظ سے بھی اور معنوی سطح پر بھی غالب کی شاعری کا اثر قبول کئے ہوئے ہے۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان دوسرے نقادوں کی آراء سے قطع نظر صرف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق لکھتے ہیں کہ:

''نئی یا جدید تر شاعری کے ظاہر و باطن دونوں پر اگر کسی اردو شاعر کا سایہ نظر آتا ہے تو وہ صرف غالب کا ہے۔''(۱)

اپنے اس نقطۂ نظر کی توضیح میں ڈاکٹر فرمان نے کئی سطحوں پر غالب کو جدید اردو شاعری کا پیش رو قرار دیا ہے۔ پہلی سطح آزاد اور حالی کی ہے۔ اقبال کے پیش نظر اور پھر اقبال کے بعد ۱۹۳۵ء کی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اگلی منزل پر ن۔م۔ راشد اور فیض احمد فیض کے کلام کو سامنے رکھتے ہوئے اور آخر میں جدید تر اردو شاعری یعنی ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان نے واضح کیا ہے کہ جدید اردو شاعری غالب کی شاعری کے اثرات سے خالی نہیں۔

(۴)

''ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب''، یہ عنوان غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی دوسری تصنیف ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے چوتھے مقالے کا

۱۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، ص ۶۹

ہے۔اس کتاب کی زینت بننے سے پہلے یہ مقالہ سالنامہ ''تحریر'' کراچی ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔اس کے بعد ''غالب نامہ'' (دہلی) جولائی ۱۹۹ء میں شائع ہوا۔(۱) اس کے علاوہ مذکورہ مقالہ ''نگار'' پاکستان کی نومبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ ''نیم تنقیدی و نیم تحقیقی'' نوعیت کا حامل ہے۔اس میں ڈاکٹر فرمان نے غالب کے اپنے اردگرد کے سیاسی ماحول پر گہری نظر رکھنے، اپنے معاصرین کی نسبت بدلتے ہوئے حالات کو جلد بھانپنے اور نئی تہذیب کا مستحسن قرار دینے کے رویے کا جائزہ لیا ہے اور غالب کے فکری ارتقاء میں کلکتہ کے سفر کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

اٹھارہوں صدی تک اردو شاعری ایک خاص روش پر گامزن تھی اور انیسویں صدی کے آغاز تک اس میں یک رنگی اور سنساٹے کی کیفیت ہی ملتی ہے لیکن غالب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے فکری اور اجتہادی سطح پر اس سکوت کو ختم کر کے شاعری کو نئی راہ پر گامزن کیا اور اس کو مقصدی وافادی شئے قرار دیتے ہوئے بتایا کہ:

> ''شاعری قافیہ پیائی نہیں معنی آفرینی ہے، مجذوب کی بڑ نہیں مطلب و مقصد سے ہم آہنگی ہے، لڑکوں کا کھیل نہیں دیدۂ بینا کی کسوٹی ہے، قد و گیسو کی آرائش نہیں دار و رسن کی آزمائش ہے، بادہ و ساغر یا دشنہ خنجر کا تذکرہ نہیں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔'' (۲)

غالب نے اپنے خطوط میں اساتذہ کے تتبع اور تقلید سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور نئی تہذیب کو کلکتے کے سفر کے بعد دل سے سراہا۔ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے فکر و نظر میں غیر معمولی وسعت اور گہرائی کے آثار حقیقتاً کلکتے کے سفر کے بعد پیدا

۱۔ ''غالب نامہ'' (تجزیاتی مطالعہ) از عاصمہ اعجاز، ص ۹۶

۲۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، ص ۱ے

ہوئے۔ اس سے قبل غالب اردو اور فارسی کی شاعری میں بیدلؔ، شوکتؔ اور اسیرؔ کا تتبع کرتے رہے لیکن کلکتے سے واپسی پر ان میں ایسا ذہنی انقلاب آیا کہ وہ بیشتر روائتی اور تقلیدی باتوں سے تائب ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفر کے بعد کے خطوط اور اشعار دونوں فکر انگیز اور جدید زاویہ نظر کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس مقالے میں غالب کے دس (۱۰) اشعار کا حوالہ دیا ہے اور ہر شعر کا سن تالیف ساتھ درج کر کے ان کی جدت خیال کو کلکتہ کے سفر کی دین قرار دیا ہے۔

غالب کے فکر و خیال کی ندرت نہ صرف ان کے اپنے اشعار میں نظر آتی ہے بلکہ ڈاکٹر فرمان کے خیال میں اس کی بازگشت علامہ اقبال کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان نے غالب اور اقبال دونوں کے کلام سے ایک ہی نوع کے اشعار نکال کر ان میں فکرِ نو کی نشاندہی کی ہے اور ظاہر ہے اس وصف میں غالب، اقبال کے پیش رو ہیں۔

غالب نے یہ بات بہت پہلے محسوس کر لی تھی کہ برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات میں مغربی تہذیت کے قمقموں کے آگے، مشرق کی مٹی کے دیے بہت دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے ''آئینِ اکبری'' (۱۸۵۵) کو نئے ڈھب سے مرتب کیا اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے سرسید کے اس عمل کو ان کی رجعت پسندی اور مردہ پروری سے تعبیر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد ازاں نئی تہذیب کے متعلق سرسید کا زاویۂ نگاہ وہی تھا جو غالب کا تھا لیکن غالب نے جس بات کو بہت پہلے محسوس کرلیا، سرسید اس تک بہت بعد میں پہنچے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان نے ڈاکٹر خلیق انجم کی رائے کی تائید کی ہے کہ:

> ''۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب تک سرسید بھٹک رہے تھے اور اپنے لئے مستقبل کا راستہ تلاش کر رہے تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے ذہن میں مستقبل کا راستہ بالکل صاف اور روشن ہوگیا تھا جس کے واضح نقوش ان کی کتاب '' اسبابِ بغاوتِ

ہند'' میں نظر آتے ہیں جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔''(۱)

نئی سوچ اور نئے طرز فکر سے متعلق غالب اور سرسید دونوں کے افکار و خیالات کو اپنے اپنے عہد میں ہدف بنایا گیا البتہ بعد ازاں اپنی اہمیت کی بدولت اس رویے کی پاسداری ہوئی۔

کلکتے کے سفر سے واپسی پر غالب نے نئی تہذیب کی آمد کا مژدہ سنایا اور تقلید کو نامستحسن قرار دیا۔ ڈاکٹر فرمان نے غالب کے ان نظریات اور نئی اقدار کے متعلق غالب کے اس نقطۂ نظر کو ۱۹۶۹ء میں اپنے ایک اور مقالے بعنوان'' غالب، شاعر امروز و فردا'' میں بھی بیان کیا ہے جو غالب پر ان کی پہلی تصنیف (غالب شاعر امروز و فردا) میں بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب خوشامد پسند و دروغ گو نہیں تھے بلکہ مجبوری اور بے بسی کے سوا غالب کسی اور عالم میں کسی کی مدح سرائی یا بے جا تعریف نہ کر سکتے تھے۔ البتہ انگریزی اور عربی تہذیب کے متعلق جن چیزوں کو اپنایا، انہیں پوری طرح اپنایا۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب نے شاعری اور نثر دونوں میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو نہ تو فریب جانا، نہ کوئی عیب خیال کیا اور نئی تہذیب کے زیر اثر مکتوب نگاری کو پرانے طرز کے طویل اور غیر ضروری القاب و آداب سے ہٹا کر اسے براہ راست مخاطبت اور بے تکلفی کے اوصاف بخشے۔

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی جدت پسندی کا بڑے فخر سے اعتراف کیا۔ مولانا حالی نے غالب کی اس باغیانہ روش کو اور تخلیقی (Originality) کا نام دے کر اس کی تائید کی۔ ان اثرات کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے حالی اور اقبال کو ایک ہی راہ کے مسافر قرار دیا۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ ایک نئی

۱۔ '' آثار الصنادید'' جلد اول، مطبوعہ اردو اکادمی، دلی، ۱۹۹۰ء، مرتبہ خلیق انجم، ص ۱۴۴

تہذیب بھی اپنی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب ان سارے حالات سے ابتدائی عمر سے ہی آگاہی رکھتے تھے۔ کچھ واقعات غالب نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنے اور کچھ باتوں کو گردو پیش کے سیاسی عمل سے بھانپا تھا۔ انہی اسباب کے پیش نظر انہوں نے نئی تہذیب کا اثر اپنے معاصرین کی نسبت بہت جلد قبول کیا۔ غالب کے اس فکری ارتقاء میں کلکتے کے سفر کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اس اثر کو غالب کے ذہن میں ایک پختہ کی صورت میں سمو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنے اشعار اور خطوط میں ان نئی اقدار کی تائید کی اور انہیں سراہا۔

(۵)

''کیا دیوان غالب ''نسخہ امرو'' واقعی جعلی ہے''، تحقیقی نوعیت کا مقالہ ہے اور ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس کتاب کا حصہ بننے سے پہلے یہ مقالہ رسالہ ''غالب'' کراچی کے شمارہ ۸، ۹ سال ۷۷۔۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں کلام غالب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا، زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بھوپال میں اس نسخے کی بازیابی سے اس کی گمشدگی کی خبر تک کے اہم نکات کو بیان کیا ہے اور پھر اس نسخے کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں مختلف آراء کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے ڈاکٹر فرمان کے اس مقالے کو معرکہ آراء ممتاز تحقیقی مقالہ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اس مقالے کے مشمولات سے جزوی یا کلی اختلاف یا اتفاق ہونا نہ ہونا ایک الگ بحث ہے جس کا یہ محل نہیں لیکن یہ مقالہ فرمان صاحب کی جرأت اظہار کی بہت اچھی مثال ضرور ہے اور اس موضوع پر بلا قید مقام اور وقت جہاں اور جب بھی بحث ہوگی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اس مقالے سے صرف نظر نہیں کیا جاسکے گا۔''
>
> (نقوش غالب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۶۱۔۲۶۲)

ابتداء میں ''نسخہ امروہہ'' کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اور دستیاب مخطوطات میں سب سے قدیم قرار دیا گیا اور اس کی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ تاہم ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق بعض اہلِ نظر کی توجہ ان کمزوریوں کی طرف اٹھی، ان میں نقاد اکبر آبادی شامل ہیں جن کا حوالہ اس مقالے میں دیا گیا ہے۔ اگر مولوی عبدالباری آسی الدنی کی تحلیق کردہ غزلیں ذہن نشین ہوں جو دیوان غالب میں شامل ہوئیں اور ان میں سے ایک اپریل فول کے حوالے سے یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ماڈل ہائی اسکول کے پرچے ''گوہر تعلیم'' (بھوپال) میں شائع ہوئی تو یہ بات قریب قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ نسخہ بھی اسی نوعیت کی من گھڑت کاوش ہو کیونکہ نسخۂ امروہہ بھی بھوپال ہی میں دستیاب ہوا اور اپریل ۱۹۶۹ء ہی کے پہلے ہفتے میں۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق ڈاکٹر انصاراللہ نظر کے علاوہ کسی نے ان کے متعلق غور و فکر سے کام نہ لیا البتہ ڈاکٹر انصاراللہ نظر نے اس کے جعلی ہونے کے امکانات کا بڑی دقت نظر سے جائزہ لیا ہے۔ بعض نے ڈاکٹر انصاراللہ نظر کی تائید کی اور بعض نے تردید لیکن کوئی واضح صورت سامنے نہ آسکی۔ جب اس نسخہ کے گم ہونے کی خبر آئی تو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق اس گمشدگی نے اس نسخہ کے جعلی ہونے کے خیال کو تقویت دی۔

''نسخہ امروہہ'' کے جعلی ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان نے اپنے اس مقالے سے کمال احمد صدیقی کی کتاب ''بیاض غالب تحقیقی جائزہ'' کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۴۸۸ صفحات پر محیط ہے جس میں بیاضِ غالب کے الف سے ی تک ایک ایک شعر کا تحقیقی جائزہ لے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ نسخہ امروہہ یکسر جعلی ہے اور کسی ماہر جعل ساز کی مشق و محنت کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کمال احمد صدیقی کی کتاب کی چند خاص باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کمزوریوں کو قابلِ اعتبار جانتے ہوئے مختلف نکات کی صورت میں تفصیلاً بیان کیا ہے، جن کے پیش نظر کمال احمد صدیقی نے نسخۂ امروہہ کو جعلی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، کمال احمد صدیقی کی رائے کی تائید کرتے ہیں کہ انہوں نے اس وقت جب

اس نسخے کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، اس کا دقت نظر سے مطالعہ کر کے مدلل انداز میں واضح کیا کہ بیاضِ غالب کے نام سے شائع کیا جانے والا دیوان غالب جسے ''نسخۂ امروہہ'' کہا جا رہا ہے، بخط غالب نہیں بلکہ جعلی ہے اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق غالبیات کے ماہرین اور محققین کو کمال احمد صدیقی کی رائے کی تائید کرنے میں اس لئے تامل ہے کہ وہ اس سے پہلے ''نسخۂ امروہہ'' کو بخط غالب قرار دے چکے ہیں لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس سے قطع نظر کمال احمد صدیقی کی تائید کرتے ہوئے واضح الفاظ میں ''نسخۂ امروہہ'' کو جعلی خیال کرتے ہیں۔

(۶)

''غالب کا اندازِ فکر اور استقبال فردا'' اس کتاب کا چھٹا مقالہ ہے۔ تنقیدی نوعیت کا حامل یہ مقالہ ان مقالوں میں سے ایک ہے جسے قند مکرر کے طور پر اس کتاب میں شامل کیا گیا کیونکہ یہ مقالہ ڈاکٹر فرمان کی غالب پر پہلی تصنیف ''غالب، شاعر امروز و فردا'' میں اسی کتاب کے ہم عنوان مقالے کے تحت شامل ہے۔ البتہ غالب پر اپنی دوسری کتاب ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں شامل کرتے ہوئے اس مقالے کے آخر میں ایک پیراگراف کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مقالہ غالب کے ''انداز فکر اور اسلوب غزل'' کے حوالے سے انداز فکر'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر فرمان کی ایک اور تصنیف ''غزل، اردو کی شعری روایت'' (۱۹۹۵ء) میں بھی شامل ہے۔ البتہ زیر نظر مقالہ ان تمام تصانیف میں شامل ہونے سے پہلے ''شاعر'' بمبئی کے ''غالب نمبر'' ۱۹۶۹ء اور ''ہمدرد'' (صحت) کراچی کے جون ۱۹۶۹ء کے شمارے میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان نے غالب کی اس انفرادیت کو واضح کیا ہے کہ غالب نے اردو شاعری کو عموماً اور غزل کو خصوصاً ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا کیا۔ اس مقالے کا تفصیلی تجزیہ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کی غالب پر پہلی کتاب میں ہو چکا ہے اس لئے اس کو دہرانا غیر ضروری ہے۔

(۷)

زیرنظر تصنیف کا ساتواں مقالہ ''غالب کا اسلوب طنز وظرافت'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مقالہ سب سے پہلے ''نگار'' کے غالب نمبر جنوری وفروری ۱۹۶۹ء میں ''غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو'' کے عنوان سے شائع ہوا اور اس کے بعد اسی عنوان کے تحت غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی پہلی تصنیف ''غالب، شاعر امروز وفردا'' میں چھپا۔ البتہ غالب پر ڈاکٹر فرمان کی دوسری تصنیف ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں اسے قند مکرر کے طور پر شامل کرنے کے لئے اس کا کچھ ابتدائی حصہ اور درمیان سے بھی کہیں کہیں اشعار اور تنقیدی رائے کو حذف کردیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مقالہ ڈاکٹر فرمان کی ایک اور تصنیف ''غزل، اردو کی شعری روایت'' میں ''غالب کے انداز فکر اور اسلوب غزل'' کے حوالے سے غالب کے ''طنزیہ لب ولہجہ'' کے تحت شامل ہے۔

یہ مقالہ تنقیدی نوعیت کا حامل ہے جس میں غالب کے کلام کے ایک اہم پہلو ''طنز'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کے طنزیہ اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں برجستگی کے ساتھ معنوی تہہ داری بھی ملتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب اپنے ماحول وشخصیت میں مطابقت پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اپنے لاشعور یا ذات سے آگاہ تھے۔

زیرنظر مقالے پر تفصیلی بحث ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے مقالے بعنوان ''غالب کے اسلوبِ سخن کا ایک اہم پہلو'' کے تحت ہوچکی ہے۔

(۸)

''کلامِ غالب میں استفہام'' زیرمطالعہ کتاب کا آٹھواں باب اور آخری مقالہ ہے۔ قطع وبرید کے کچھ مراحل سے گزرنے کے باوجود اس کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے غالب پر سب سے پہلے مضمون بعنوان ''غالب کے کلام میں استفہام'' پر مشتمل ہے جو سب سے پہلے ''نگار'' مئی ۱۹۵۲ء میں، اس کے بعد ''نگار'' کے غالب نمبر

جنوری، فروری ۱۹۶۹ء میں، پھر ''نگار'' کے فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں ''غالب، شاعر امروز و فردا'' (۱۹۷۰ء) کے آٹھویں مقالے کی صورت میں ''سہ ماہی'' ''ادیب'' علی گڑھ، جنوری تا جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع ہوا اور سب سے اہم بات یہ کہ ''تنقید غالب کے سو سال'' (مرتبہ فیاض محمود) میں اُسے غالب پر اوریجنل مضمون خیال کرتے ہوئے ۱۹۶۹ء میں اس کتاب کا حصہ بنایا گیا۔ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں شائع ہونے کے ساتھ یہ مضمون اپنی اہمیت اور موضوع کی انفرادیت کے پیش نظر ۱۹۹۵ء ہی میں ڈاکٹر فتحپوری کی ایک اور تصنیف بعنوان ''غزل، اردو کی شعری روایت'' میں ''غالب کا انداز فکر اور اسلوب غزل'' کے حوالے سے ''استفہامیہ لب و لہجہ'' کے تحت شائع ہوا۔ یہ مقالہ تنقیدی نوعیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے غالب کے استفہامیہ لب و لہجہ پر پہلے مضمون اور زیر مطالعہ کتاب میں شامل مضمون میں کچھ اختلافات ہیں کہ اس مضمون کے ابتدائی حصے کو حذف کر دیا گیا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں الفاظ کے رد و بدل سے جملوں میں اختصار پیدا کیا گیا ہے جب کہ اختتام میں اضافہ کے طور پر غالب کی بارہ (۱۲) استفہامیہ غزلوں کے مطلع نقل کئے گئے ہیں۔ یہ غزلیں مطلع تا مقطع استفہامیہ ہیں۔ ان غزلوں کے پیشِ نظر ڈاکٹر فرمان کے اسلوبِ غزل کی انفرادیت کو بڑی حد تک ان کے استفہامیہ لب و لہجہ کا مرہونِ منت قرار دیتے ہیں۔ اس مضمون کا بنیادی مآخذ ڈاکٹر فرمان کا وہی مضمون ہے جو ''نگار'' مئی ۱۹۵۲ء میں چھپا اور اُس کا تفصیلی تجزیہ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے تحت ہو چکا ہے، اس لئے اس کا یہاں دہرانا نامناسب ہے۔

☆

''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے آخیر میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نسخہ حمیدیہ سے چند اشعار'' کے عنوان سے ۲۹ اشعار کو درج کیا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کلام غالب کے ابتدائی متن پر مشتمل ہے۔ یہ قلمی نسخہ کتب خانہ بھوپال سے دستیاب ہوا جسے انوار الحق ڈائریکٹریٹ تعلیمات ریاست بھوپال نے عبدالرحمن

بجنوری کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''یہ وہی قدیم ترین اردو دیوان ہے جسے خود غالب نے ابتداً ردیف دار مرتب کیا تھا۔ بعد کو اس میں ترمیم، تنسیخ اور اضافے سے کام لے کر صرف منتخب کلام کو اردو دیوان کے نام سے شائع کیا۔''(۱)

اس نسخہ کی اشاعت پر اعتراض بھی ہوئے لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے ان کے رتبۂ شعری پر کوئی حرف نہیں آیا بلکہ اس کے ذریعہ ان کی مقبولیت و شہرت کے امکانات کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔ بلکہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے غالب کے فکر و فن دونوں کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہوگی۔

چنانچہ دیوان غالب ''نسخہ حمیدیہ'' کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر فرمان نے اپنی اس تصنیف کے آخیر میں اس نسخے سے چند اشعار کو نقل کیا ہے۔

۱۔ ''غالب''، نسخہ حمیدیہ کی روشنی میں'' مضمون نگار ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ مشمولہ ''ماہ نو'' جنوری فروری ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)

ساتواں باب

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا غالب سے متعلق تازہ علمی کارنامہ

شرح دیوان غالب اردو

غالب پر دو مُستقل مجموعہ ہائے مضامین سے قطع نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب شناسی کا ایک تازہ ثبوت، کتابی حجم کی اُن کی ''شرح دیوانِ غالب اردو'' ہے جو ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

سیّدہ افصح وحید

شرح دیوان غالب:

غالبؔ پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اولین کتابی کاوش ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے عنوان سے ۱۹۷۰ء میں کتابی صورت میں آئی اور اس کے پچیس برس بعد ۱۹۹۵ء میں ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بارِ دگر غالب سے اپنی وابستگی کا ثبوت فراہم کیا۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے کام کا بڑا حصہ ان دونوں تصانیف میں سما گیا ہے۔ اس کے باوجود کچھ مقالات، تبصرے اور اداریے ایسے بھی ملتے ہیں جو ان تصانیف میں شامل تو نہیں لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب کے تعلق کی اہمیت اور نوعیت کو اجاگر کرتے ہیں اور غالب شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں بعض مقالات اور ادبی نگارشات اگرچہ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' سے بھی پہلے کی ہیں اور باقی بھی قریب قریب ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' سے پہلے قلم بند کی گئیں لیکن ان تصانیف کا حصہ نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ ان میں ادبی چاشنی کا فقدان نہیں بلکہ ان کے مطالعے سے بطور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے فکر و فن کے لئے زاویوں اور ارتقاء کی انوکھی منزلوں کی نشاندہی بخوبی کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ مقالات، تبصرے اور اداریے بجائے خود ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب پر دو مستقل تصانیف، غیر مرتب ادبی مقالات، تبصرے اور دیگر نگارشات سے قطع نظر حال ہی میں ان کی غالب شناسی کا ایک تازہ ثبوت کتابی حجم کی ان کی شرح دیوان غالب ہے جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب شناسی کے حوالے سے ان کے اس نئے اور اہم علمی کام کا ذکر ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری جب ۱۷ اپریل ۱۹۹۶ء کو لاہور تشریف لائے تو غالب سے

متعلق ان کے کتابی حجم کے ایک نئے کام کا انکشاف ہوا جو شرح دیوان غالب، کی صورت میں عنقریب منظر عام پر آ کر غالب شناسوں کو دعوت فکر و نظر مہیا کرے گی۔

شرح ''دیوان غالب'' کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

☆ شرح کی غرض و غایت اور وہ حالات جن میں یہ لکھی گئی، اس سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں:

''مجھے غالب کو سمجھنے کا شوق شروع سے ہی ہے، اسی وجہ سے شرح لکھنے کا ارادہ تو پہلے ہی متعدد بار کیا لیکن دیوان غالب کی کئی شرحیں پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں مگر شارحین نے اسے بے حد پیچیدہ شاعر بنا دیا ہے حالانکہ غالب اتنا مشکل، پیچیدہ اور الجھا ہوا نہیں چنانچہ ان حالات میں اس لئے بھی شرح کا خیال چھوڑ دیا کہ میں بھی دیگر شارحین کی طرح کہیں غالب کو الجھا نہ دوں۔

بہر کیف جب میں اپنے بیٹے کے پاس امریکہ گیا جو نیویارک کی ریاست فلورائیڈ میں مقیم تھا تو وہاں میرے پاس دیوان غالب کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی ماسوائے قرآن شریف کے (جس کی تلاوت عبادت کے ساتھ میری ایک عادت ہے) اور وہاں بیٹے کے پاس بھی اردو کی کوئی کتاب نہ تھی۔ کچھ دن تو اخبارات کا مطالعہ اور دو تین مضامین لکھنے میں گزرے لیکن ایک پڑھنے لکھنے والے شخص کو ان حالات میں کہاں چین آتا ہے چنانچہ اس تمام پس منظر میں پھر میں نے ''دیوان غالب'' کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا کہ وقت بھی کٹے گا اور کام بھی ہو جائے گا۔''

☆ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنی شرح کی انفرادیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''کسی بھی تحریر کو قلم بند کرنے کے لئے دس دفعہ سوچنا اور پڑھنا پڑتا ہے اور پھر اسے الفاظ کا لبادہ پہنانا ممکن ہوتا ہے لیکن اس شرح کی تخلیق کے وقت میں تنہا تھا اور ''دیوان غالب'' کے سوا کوئی اور کتاب بھی میرے پاس نہ تھی لیکن جب میں نے لکھنا

شروع کیا تو ابتدائی دو تین غزلوں تک تو الجھن رہی پھر طبیعت نہ صرف اس کام میں لگ گئی بلکہ دو (۲) ماہ پانچ (۵) دن میں پورے دیوان کی شرح لکھ ڈالی۔ مکمل شرح دیوان غالب جو ہاتھ سے کاغذ پر لکھے ہوئے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اسے میں اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ یہ تمام شرح ایک ہی دفعہ کی لکھی ہوئی ہے کیونکہ یہ میری عادت ہے کہ اپنی لکھی ہوئی تحریر دوبارہ نہیں پڑھتا، کتاب تو دور کی بات ہے۔ بہر حال کاتب کے لئے دوبارہ لکھوا کر پھر مقدمے کے ساتھ شائع کرواؤں گا۔''

☆ ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے جب اتنی شرحوں کی موجودگی میں شرح دیوان غالب لکھنے کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے جن نکات کو پیش کیا، وہ درج ذیل ہیں:

اول: ان شرحوں کی طرف سے میری بے اطمینانی ہے کہ شارحین ''دیوان غالب'' کی شرح کرتے ہوئے الفاظ کی تہہ تک نہیں پہنچے۔

دوم: شارحین نے شرح لکھتے ہوئے آسان اشعار کو پیچیدہ بنا کر غالب کو ایک مشکل اور الجھے ہوئے شاعر کی صورت میں پیش کیا۔

سوم: غیر اہم بات کا بتنگڑ بنا دیا اور جہاں مختصر ذکر درکار تھا، وہاں بے جا طوالت سے کام لیا گیا اور جہاں وضاحت کی ضرورت تھی، وہاں بات کو ایک ہی سطر میں نمٹا دیا گیا۔

چہارم: ہر دور کی زبان مختلف ہوتی ہے یعنی زبان ہر دور میں بدل جاتی ہے جیسے یوسف سلیم چشتی کی ''شرح دیوان غالب'' میں جو زبان استعمال ہوئی، اس سے آج کا طالب علم اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اس کے عہد کی زبان نہیں۔ لہٰذا میں نے یہ سوچا کہ میں جس عہد (age) میں رہتا ہوں، اس کی زبان میں ''دیوان غالب'' کی شرح لکھوں تاکہ آسان اور مؤثر انداز سے ابلاغ ممکن ہو سکے۔

☆ غالب کے اشعار کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں کہ:

''شعر میں لفظ اس طرح منسلک ہوتے ہیں جیسے رعایت لفظی ہوتی ہے، جیسے غالب کا یہ شعر:

شور پند ناصح نے، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

یہاں نمک چھڑکنے کا جواز کہاں آیا؟ جہاں تک غالب کا تعلق ہے تو وہ بلا جواز ایک لفظ بھی شعر میں شامل نہیں کرتے۔ میرے خیال میں شور کا لفظ استعمال کر کے غالب نے اس سے نمک چھڑکنے کا جواز پیدا کیا ہے اور جو شارح یہ نہیں لکھتا، میں اسے نہیں مانتا۔''

☆ شارحین کی اہلیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ:

''شارحین کے لئے فارسی اور اردو کلام کی شرح کرنے کے لئے فارسی زبان سے آشنائی ہونا ضروری ہے اور اس کے متعلق ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے کہا کہ:

''فرمان صاحب کی فارسی اتنی اچھی ہے جتنی اردو، اور اردو اتنی اچھی ہے جتنی فارسی۔''

(مقالہ نگار سے مکالمہ: ۱۸۔اپریل، ۱۹۹۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی شرح کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک خداساز بات ہوئی۔''

لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ان کی قابلیت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''فرمان بھائی کے پاس حاضر اور نقد علم بہت ہے۔''

(مقالہ نگار سے مکالمہ: ۱۸۔اپریل ۱۹۹۶ء)

☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحقیق و تنقید کی وضاحت اور شرح دیوان غالب کے حوالے سے اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''تحقیق اور تنقید میں فرق ہے۔ تحقیق کے لئے معلوم ہونا ضروری ہے اور پھر اسے پرکھنے کا عمل تنقید کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں تحقیق واقعات کو جمع کرتی ہے۔ ایک تحقیق امر واقع کا تعین کرتی ہے اور دوسری اطلاع ہے کہ آیا یہ تمام باتیں شاعری کی تفہیم میں کس حد

تک مدد کرتی ہیں چنانچہ تحقیق وتنقید کو دو مدارج میں تقسیم کر سکتے ہیں:

اول: اطلاعاتی

دوم: اضافی یا معلوماتی

غلام رسول مہر کی کتاب ''غالب'' محض اطلاع یا معلومات فراہم کرتی ہے جبکہ شیخ محمد اکرام کی کتاب ''غالب نامہ'' تحقیقی حیثیت رکھتی ہے اور محض معلومات فراہم نہیں کرتی بلکہ امرِ واقع کا تعین کر کے قاری کی تنقیدی رگ کو بھی پھڑ پھڑاتی ہے، اس لئے ان کی کتاب زیادہ پڑھی گئی۔

تنقید میں یہ نکتہ اہم ہے کہ ناقد جو ادب پر کام کر رہا ہے، وہ محض معلومات فراہم کر رہا ہے یا ادب کی تفہیم کے لئے معاون و مددگار بھی ثابت ہو رہا ہے، اسی بناء پر تحقیق کو تنقید سے منسلک رہنا چاہیے اور کوئی تنقید کارآمد نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ تحقیق سے منسلک نہ ہو۔

اب تحقیق وتنقید کے ان قواعد وضوابط کو مدنظر رکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب کو سمجھنے میں کوئی کتاب مدد دیتی ہے یا محض شیلف کی زینت ہے۔ اچھی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اسلوب اثر پذیری کی صفت رکھے اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرے۔

تحقیق وتنقید سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ان خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں منظرعام پر آنے والی ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب ''شرح دیوان غالب'' ان تمام اوصاف کی حامل ہوگی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری خود اپنی شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''دوسری شرحوں کے مقابلے میں اچھا کام ہے۔ آج کے
> طالب علموں کے لئے کچھ باتیں اس میں ضرور ایسی ہوں گی جو
> ان کے لئے فائدہ مند ہوں۔''

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے گفتگو: مورخہ ۱۸۔ اپریل ۱۹۹۶ء)

آٹھواں باب

بسلسلۂ غالب ڈاکٹر فرمان کے غیر مُرتّب مقالات

فرمان صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد قاری کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔۔ان کے مضامین کی اپنی ایک زندگی اور چلت پھرت ہوتی ہے۔۔ان کے مضامین ہانپتے نہیں تیز رفتار ہوتے ہیں۔۔وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے،سیدھی سادی دلیلیں دیں اور مضمون ختم!

سجاد باقر رضوی

بحیثیت مُحقق، نقاد اور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے قلم کی قلمرو بہت وسیع ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

فرمان صاحب غالب کو بہت مانتے ہیں، مگر اس سلسلے میں غالب کے اس مصرعے کی معنویت کو منوانے پر اصرار نہیں کرتے کہ ؎

وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیئے

وہ نشتر کی آب داری کو ترجیح دیتے ہیں۔

رشید حسن خاں

غیر مرتب مقالات

غالب کے فکر وفن اور ان کی ذات و خدمات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مقالات کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۷۰ء میں اور دوسرا ۱۹۹۵ء میں۔۔۔لیکن غالب کے بارے میں فرمان صاحب کے کچھ مقالات ایسے بھی ہیں جو غالب سے متعلق ان کے مجموعہ ہائے مضامین میں شامل نہیں ہو پائے۔اس باب میں ایسی چند غیر مرتب اور متفرق تحریروں کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

(۱)

''غالب،۔۔۔نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نوعیت کا حامل مقالہ ۱۹۷۱ء میں ''نقوش'' (لاہور) کے غالب نمبر۳، شمارہ ۱۱۶ میں شائع ہوا۔اس کے بعد مذکورہ مقالہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تصنیف ''نیا اور پرانا ادب''، جو ۱۹۷۴ء میں کراچی میں شائع ہوئی، کی زینت بنا۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''غالب صدی'' کے سلسلے کی ایک نئی دریافت ''دیوان غالب بخط غالب'' کے حوالے سے غالب کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔یہ دریافت محمد طفیل مدیرِ نقوش کی مساعی سے منظرِ عام پر آئی اور اسے کئی ناموں مثلاً نسخہ عرشی زادہ، نسخہ بھوپال بخط غالب، نسخہ امروہہ، ''غالب کی نو دریافت بیاض'' اور ''نسخۂ لاہور'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق اس پر درجنوں تحقیقی مقالے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں جو ان متعدد سوالات کے بساط بھر جوابات فراہم کرتے ہیں جو غالب کی ''نو دریافت بیاض'' کے مطالعے کے وقت قاری کے ذہن میں ابھر سکتے ہیں۔البتہ بیاض کا تنقیدی نقطۂ نظر سے کوئی قابلِ ذکر جائزہ نہیں لیا گیا اور یہ باور نہیں کرایا گیا کہ اس کی اصل اہمیت کن وجوہات کی بدولت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس مقالے میں ''بیاض'' کی اہمیت صرف غالب کے ہاتھ

کا ایک قدیم مخطوطہ ہونے تک محدود نہیں کرتے بلکہ اسے غالب کے مرتبۂ شعری اور ادعاتِ فن کے ثبوت میں نئی دلیلوں اور تاویلوں کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف غالب کے ارتقائے فکر وفن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ غالب کے بہت سے بے دلیل دعوؤں کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ دعویٰ کہ ان کی غزل عموماً بارہ (۱۲) بیت سے زیادہ اور نو (۹) شعر سے کم نہیں ہوتی اور یہ کہ ان کی غزلیں کسی استاد کی زمین کی بجائے طبع زاد زمینوں میں ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کا یہ دعویٰ ان کی قوت متخیلہ اور جولانیٔ طبع کا پتہ دیتا ہے۔

مذکورہ بیاض کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے پیشِ نظر غالب کے صاحبِ دیوان ہونے کی عمر پورے چھ سال کم ہوگئی کیونکہ نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے مطابق غالب نے اپنا دیوان پچیس (۲۵) برس کی عمر میں مرتب کیا تھا جبکہ اس بیاض کی روشنی میں اس وقت غالب کی عمر انیس (۱۹) سال سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر فرمان نے چند اشعار کی معنوی تہہ داری کو بیان کرتے ہوئے غالب کی عظمت کو اس بیاض کی روشنی میں دوبالا کیا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے پیش نظر یہ اشعار پچیس (۲۵) برس کی عمر کی مشقِ سخن کا نتیجہ تھے لیکن اس بیاض کے مطابق انیس (۱۹) برس کی عمر کا حاصل ہیں۔ مذکورہ اشعار کی اہمیت کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''یہ اشعار ہر چند کہ انیس سال یا اس سے بھی کم عمری کی تخلیق ہیں لیکن بلحاظِ عمر اتنے بلند پایہ ہیں کہ اگر غالب ان کے سوا اور کچھ نہ کہتے تو بھی ان کے موجودہ مرتبہ شاعری میں فرق نہ آتا۔ وجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں سے متعدد ایسے ہیں جن کا حوالہ دیئے بغیر غالب کی عظمتِ شاعرانہ کا ذکر آج بھی مکمل نہیں کیا جا سکتا۔'' (۱)

۱۔ ''غالب، نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' مشمولہ ''نقوش'' غالب نمبر ۳ شمارہ ۱۱۶ سال ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۴

مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر ؎

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ''بیاض'' کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ حالی کی بیان کردہ اس روایت کو کہ میر تقی میر نے غالب کے اشعار سن کر ان کی طباعی پر حیرت کا اظہار کیا تھا، مستند قرار دیتی ہے۔ اس روایت کو حالی (۱)، مالک رام (۲)، امتیاز علی عرشی (۳) اور خود غالب (۴) کے بعض بیانات و اقوال کے باوجود بھی بعض ناقدین کی طرف سے ناقابل اعتبار قرار دیا جا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''نو دریافت بیاض کی موجودگی میں میر کی بابت حالی کی بیان کردہ روایت کو باور کرنے میں تامل کی گنجائش نہیں رہتی۔'' (۵)

جو شخص انیس (۱۹) برس کی عمر میں ایسا قابل قدر دیوان مرتب کر سکتا ہے، وہ اگر بارہ (۱۲)، تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں قابلِ توجہ اشعار کا موجد قرار پاتا ہے تو یہ عین قرین قیاس ہے کہ ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مقالے میں غالب کے نو (۹) اشعار کا حوالہ دیا ہے جو بعض تذکروں اور شہادتوں کی موجودگی میں انیس (۱۹) برس کی عمر سے پہلے معرض وجود

۱۔ یادگار غالب، ص ۱۳۶، مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور

۲۔ ذکر غالب، ص ۴۰

۳۔ دیباچہ نسخہ عرشی، ص ۱۳

۴۔ خط بنام بلگرامی مشمولہ ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۴۶۰

۵۔ ''غالب''، نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' مشمولہ'' نقوش، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۹۷۱ء، ص ۴۷۲

میں آئے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

ڈاکٹر فرمان کے خیال میں ''بیاض'' کی اہمیت اور انفرادیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے غالب کا بہت سا ایسا کلام سامنے آیا جس کا واحد ماخذ یہ بیاض ہے، اس میں پچیس (۲۵) غزلیں، چودہ (۱۴) رباعیاں اور متعدد منفرد اشعار شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان نے زیرِ مطالعہ مقالے میں غالب کے مذکورہ کلام کے حوالے سے تئیس (۲۳) اشعار کا حوالہ دیا ہے کہ جو نہ صرف غالب کے فکروفن کے بعض پہلوؤں کی تفہیم میں مددگار ہیں بلکہ غالب کے فنِ شاعری کے عروج تک کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے اس ''نو دریافت بیاض'' کی پذیرائی اور اہمیت کو متعین کرتے ہوئے اس کے وجود پر متوقع الزام کا بھی دلائل سے جواب دے کر اس بیاض کو تنقیدی نقطۂ نظر سے غالب کے کمالِ فن کو سمجھنے کے سلسلے کی اہم دستاویز قرار دیا ہے۔ اگر غالب کے نقطۂ نظر سے ان اشعار کو ناقابلِ اشاعت اور ناقابلِ انتخاب سمجھا جائے تو غالب کی شاعرانہ عظمت کی بہت سی ناقابلِ تردید شہادتیں گوشہ گمنامی میں چلی جائیں گی۔ اس لحاظ سے وہ ناقدین جو غالب کے نقطۂ نظر سے حذف شدہ کلام کی اشاعت پر معترض ہیں، ان کی تشفی وتسلی کے لئے ڈاکٹر فرمان غالب کے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ:

> ''ایک شاعر چونکہ اولاد معنوی ہونے کی حیثیت سے اپنے اشعار سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے، اس لئے اس کے لئے اپنے کلام کا انتخاب کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعراء نے اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، عام طور پر خود کو رسوا ہی کیا ہے۔'' (۱)

۱۔ ''غالب''، نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' مشمولہ'' نقوش، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۹۷۱ء، ص ۴۷۶

اس ضمن میں وہ غالب کے علاوہ میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، قائمؔ، مصحفیؔ اور شیفتہؔ کا حوالہ دیتے ہوئے شاعر کے مقام کا متعین کرنے کے لئے اس کے کلام کے اس حصے کو پیش نظر رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جسے شاعر نے اپنے انتخاب سے حذف کر دیا ہے اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان کے مطابق ''نو دریافت بیاض غالب'' بھی قابلِ توجہ ہے۔

کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بیاض غالب کے تحقیقی جائزہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ تبصرہ نگار غالب پر اور بھی کچھ اس موضوع سے متعلق لکھا گیا ہے، پوری طرح واقف ہے۔''(۱)

(۲)

''نقشہائے رنگ رنگ'' کے زیر عنوان ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تنقیدی نوعیت کا حامل مقالہ ''نگار'' اور ''ہماری زبان'' کے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

زیر مطالعہ مقالہ دراصل شاہ حسین عطا کے اس مقالے کا تنقیدی جواب ہے جو اس عنوان کے تحت ''کتابی دنیا'' کے اگست ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اپنے مقالے میں شاہ حسین عطا نے غالب کے اس فارسی شعر۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی شرح اور تفہیم کے ضمن میں علماء ادباء کی شعرفہمی پر طنز کیا کیونکہ ان کے نزدیک اس شعر کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اردو پر ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مقالے میں شاہ حسین عطا کی اس رائے کی تردید کی ہے اور نہ صرف مذکورہ شعر سے پہلے اور بعد کے اشعار، مختلف لغات اور غالب کے خطوط کے

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔۔ایک تاثر''، مقالہ نگار کمال احمد صدیقی (دہلی) مشمولہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، ترتیب و تدوین، امراؤ طارق، جلد سوم، ص ۲۴۱

حوالوں سے اپنے مطمح نظر کو واضح کیا ہے بلکہ اس شعر کی باریک بینی سے وضاحت کرتے ہوئے اس بات کا تعین کیا ہے کہ:

> ''اردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرنے اور فارسی کے متعلق ''بین'' اور اردو کے متعلق ''بگذر'' کا حکم لگانے کا منطقی نتیجہ کیا اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے گھٹیا خیال کرتے تھے۔''(۱)

غالب کا اپنے اردو خطوط کے متعلق یہ دعویٰ کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، بہت بعد کا ہے۔ ابتداً تو وہ اپنے خطوط کی اشاعت کے بھی مخالف تھے اور ان کی شہرت کو اپنی سخنوری کے منافی قرار دیتے تھے لہذا ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے شاہ حسین عطا کے اس نقطۂ نظر کو کہ غالب نے خطوط کے ضمن میں اردو کو فارسی پر ترجیح دی ہے، بعید از قیاس قرار دیا ہے اور اس مقصد کے پیش نظر شاہ حسین عطا نے جس خط کا حوالہ پیش کیا تھا، وہ بھی ڈاکٹر فرمان کے پیش نظر مغالطہ آمیز ہے۔ چنانچہ شاہ حسین عطا جیسے اہلِ نظر کی اس رائے پر اظہارِ تعجب کیا ہے کہ انہوں نے خط کے:

> ''سیاق و سباق کو محذوف کر کے اپنے کام کی سطریں اس خط سے نقل کر دی ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان نے یہ بات واضح کی ہے کہ غالب نے اپنی فارسی دانی یا فارسی نظم و نثر کو اردو نظم و نثر پر ہمیشہ ترجیح دی ہے اور اس حوالے سے شاہ حسین عطا کی آراء قابل اعتبار نہیں۔

۱۔ ''نقشہائے رنگ رنگ''، مشمولہ ''نگار'' مارچ ۱۹۶۷ء ص ۵۵

۲۔ ''نقشہائے رنگ رنگ''، مشمولہ ''نگار'' مارچ ۱۹۶۷ء ص ۵۶

(۴)

"رباعی کا ایک اہم دور" (غالب وانیس کا زمانہ) کے عنوان کے تحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ ان کی تصنیف "اردو رباعی" (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ تحقیقی نوعیت کا حامل ہے جس میں ڈاکٹر فرمان نے غالب وانیس کے عہد میں رباعی کی قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے کیونکہ یہ عہد رباعی کے لئے بہت مفید تھا جس نے رباعی کو اردو شعر و سخن میں ایک بلند مقام عطا کیا۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دہلی میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ اور لکھنؤ میں انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام کے حوالے سے رباعی کی نوعیت اور رباعیات کے کہنے میں ان کے مقام کو متعین کیا ہے۔ غالب کی رباعیات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "غالب کے یہاں تو صرف چودہ پندرہ رباعیاں ہوں گی۔ دو چار حمد و نعت میں، ایک دو اہلِ بیت کی مدح میں، چند بادشاہ کی تعریف میں۔ صرف تین چار رباعیاں عشقیہ ہیں، وہ بھی پھیکی اور بے مزہ۔ یہی نہیں بلکہ ایک جگہ انہوں نے رباعی کے وزن میں دھوکہ بھی کھایا ہے۔۔۔ غرض کہ شاعری کی وہ بلند سطح جو غالب کی غزلوں میں ملتی ہے، رباعیوں میں نظر نہیں آتی۔" (۱)

اس حوالے سے غالب کی دو رباعیوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ غالب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان ذوقؔ کی رباعیوں کو غالبؔ اور ظفرؔ دونوں سے بہتر قرار دیتے ہیں اور مومن کی رباعیوں کے محاسن کو بیان کرتے ہوئے وہ اس حوالے سے مومنؔ کو غالبؔ اور ذوقؔ پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ میں انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام میں رباعیات کے معیار کو بیان کیا ہے اور مثالوں سے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

۱۔ "اردو رباعی" ص ۸۱، مطبوعہ: مکتبہ عالیہ، لاہور

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مطمحِ نظر یہ واضح کرنا ہے کہ غالب و مومن اور انیس و دبیر کا عہد رباعی کے لئے بڑا سودمند ثابت ہوا کیونکہ:

''دہلوی شعراء کی بدولت عشقیہ مضامین میں تنوع اور تازگی پیدا ہوئی۔ لکھنوی شعراء کے ہاتھوں اخلاقی اور مصلحانہ طرزِ فکر سے رباعی روشناس ہوئی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ان ادوار میں رباعی کی پذیرائی اس طور ہوئی کہ وہ دوسرے اصنافِ شعر کے ہم مرتبہ ہوگئی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی مذکورہ تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے نورین فردوس لکھتی ہیں:

''فرمان صاحب کی اس کتاب میں تنقید کیساتھ تحقیق بھی ملتی ہے اور غالب کے کلام اور زندگی کے بعض حقائق کا انکشاف بھی کرتی ہے۔''(۲)

(۴)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا ایک مقالہ ''پروفیسر حمید احمد خان اور مرزا غالب'' کے عنوان سے ''افکار'' کے حمید احمد خان ایڈیشن میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے حمید احمد خان کی غالب شناسی کے حوالے سے خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور غالب سے متعلق ان کے تعلق اور عقیدت کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، حمید احمد خان کی خوبیوں کو گرداننتے ہوئے ان کی وفات کو علم و دانش کی دنیا کا ایک ناقابلِ تلافی سانحہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں بیسویں صدی میں اردو کے صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کا کلام بیسویں صدی کے قارئین کے لئے غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے۔ ایک

۱۔ ''اردو رباعی'' ص ۹۱، مطبوعہ: مکتبہ عالیہ، لاہور

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری بطور محقق مقالہ نگار، نورین فردوس ۱۹۹۱ء (غیر مطبوعہ) ص ۶۲

غالب اور دوسرے اقبال۔ پروفیسر حمید احمد خان ان دونوں شعراء سے گہری عقیدت رکھتے تھے بلکہ غالب کے لئے یہاں تک کہتے ہیں

''میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔''(۱)

غالب شناسی کے حوالے سے حمید احمد خان کا سب سے منفرد کام ''نسخۂ حمیدیہ'' کی نئی ترتیب وتدوین اور تازہ اشاعت ہے۔(۲)''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت مفتی انوار الحق کی نگرانی میں ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے ہوئی۔گو کہ یہ اشاعت بڑی احتیاط واہتمام سے کی گئی لیکن پھر بھی چند نکات پر اہل نظر متفق نہ تھے لیکن ان کے متعلق حتمی رائے وقت، محنت اور وقت نظر کی طالب تھی۔حمید احمد خان نے ۱۹۳۸ء میں بھوپال کے کتب خانے میں بیٹھ کر نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کی ایک ایک سطر کا تقابلی مطالعہ کیا اور پھر اس کی از سر نو ترتیب وتدوین کی اور حواشی اور مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔حمید احمد خان نے مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں بیان کردہ چند خیالات کی تردید کر کے ان کی منطقی وضاحت بھی کی ہے اور مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ساتھ ہی بہت سی کمزوریوں کا ازالہ کیا ہے جو مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے میں موجود تھیں۔اس کے علاوہ ''نسخۂ حمیدیہ'' میں حمید احمد خان نے اہل تحقیق کے لئے قابل توجہ سوالات اٹھائے ہیں اور ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کی تفتیش غالب کے سلسلے میں بہت ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان کو مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے پر فوقیت دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اردو زبان وادب اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر پروفیسر

۱۔ ''غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' مطبوعہ مجلس یادگار غالب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۳

۲۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ حمید احمد خان، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء

حمید احمد خان کا ایسا احسان ہے جسے ادب کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے تنقید غالب کے سلسلے میں حمید احمد خان کے ایک اور منفرد مقالے ''غالب کی شاعری میں حسن و عشق'' کا حوالہ دیا ہے جو ابتدا فروری ۱۹۴۹ء میں ''ہمایوں'' (لاہور) میں شائع ہوا اور نظر ثانی کے بعد ''تنقید غالب کے سو سال'' (۲) میں چھپا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (۳) کے مقالے کے بعد غالب پر دوسرا اہم تنقیدی مقالہ ہے لیکن عبدالرحمٰن بجنوری کے مقالے کے برعکس اس کی نوعیت جذباتی نہیں بلکہ سنجیدہ فکر کی حامل ہے۔ اس مقالے میں حمید احمد خان حسن و عشق کے باب میں غالب کے اشعار کو تعمق و تنوع کا حامل قرار دیتے ہیں اور ان کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شعراء میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔''(۴)

حمید احمد خان نے اپنے مقالے میں عکس ریزی کے لئے جگہ جگہ اشعار و امثال کے مرقعوں سے اپنی بات کو قابلِ اعتبار بنایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں حمید احمد خان نے نہ صرف غالب پر خود توجہ دی بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی چنانچہ بحثیت وائس چانسلر حمید احمد خان کی سرپرستی میں مجلس یادگار غالب نے تصانیف غالب اور اس کے علاوہ تنقید غالب کے سلسلے کی چار کتابیں شائع کیں جن میں ''تنقید غالب کے سو سال'' (۵)

۱۔ ''حمید احمد خان اور مرزا غالب'' مشمولہ ''افکار'' ۱۹۷۰ء ص ۶۵

۲۔ ''مطبوعہ ''مجلس یادگار غالب'' پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۳۔ ''محاسن کلام غالب'' مشمولہ ''تنقید غالب کے سو سال''، ص ۱۲۳۔۱۵۳

۴۔ ''حمید احمد خان اور مرزا غالب'' مشمولہ ''افکار'' ص ۶۷، ۱۹۷۰ء

۵۔ مرتبہ فیاض محمود اور اقبال حسین ۱۹۶۹

''غالب ذاتی مشاہدات کے آئینے میں''(۱)، اشاریہ غالب''(۲) اور "Ghalib, a Critical Introduction"(۳) شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مذکورہ کتابوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حمید احمد خان کی غالب سے دلچسپی کو سراہا ہے۔ حمید احمد خان کی نمایاں خدمات کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگرچہ حمید احمد خان نے تعلیم انگریزی کی حاصل کی مگر محبت اردو سے کی اور مجلس ترقی ادب لاہور میں ناظم کی حیثیت سے اردو کلاسیکس کے سلسلۂ اشاعت کو تیز کیا۔ اس کے علاوہ نہ صرف جشن غالب کے موقع پر اہم کتابیں شائع کیں بلکہ شدید مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں تاریخ ادبیات کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری حمید احمد خان کے انہی کارہائے نمایاں کا حوالہ دیتے ہوئے اور خصوصاً تحقیق وتنقید غالب کے سلسلے میں ان کی خدمات کو اہلِ نظر کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رہنے کا موجب قرار دیتے ہیں۔

(۵)

''دیوان غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں'' کے زیرِ عنوان مقالہ ''نگار'' کے ''غالب نمبر'' جنوری فروری ۱۹۶۹ء کا اداریہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ''قومی زبان'' کراچی کی فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا۔

عام طور پر لوگ دیوان حافظ سے فال نکالتے تھے لیکن ڈاکٹر فرمان نے یہ کام دیوان غالب سے لیا ہے کیونکہ وہ عبدالرحمن بجنوری کی رائے:

> ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں

۱۔ مرتبہ عبدالشکور احسن اور سجاد باقر رضوی ۱۹۶۹ء

۲۔ از سید معین الرحمن، ۱۹۶۹ء

۳۔ از سید فیاض محمود، ۱۹۶۹ء

بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔''(۱)

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے غالب کے اس شعر کے مصداق قرار دیتے ہیں ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس نقطۂ نظر کی بدولت یہ مقالہ ایک آپ بیتی اور ''دیوان غالب'' سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ذاتی تاثرات کا عکاس ہے۔

غالب کے جشن صدسالہ (۱۹۶۹ء) پر ڈاکٹر فرمان ''نگار'' کا ''غالب نمبر'' نکالنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے کیونکہ ان کی خیال میں غالب کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ ان کے متعلق کوئی تازہ اور کارآمد مضامین کا فراہم کرنا آسان نہ تھا چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں غالب سے مشورہ لینے کی خاطر ''دیوان غالب'' سے فال نکالنے کا کام لیا اور یہ شعر سامنے آیا۔

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

جس سے گویا غالب نے ''غالب نمبر'' نکالنے کی ممانعت کر دی لیکن قارئین کے خطوط اور ''غالب نمبر'' نہ نکالنے کے سوالات پر انہیں دو مرتبہ اور فال نکالنے پر مجبور کیا مگر جواب بدستور ''نہ'' ہی ملا۔ پھر بعض ادیبوں نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''نیاز صاحب ہوتے تو ضرور اس موقع پر کچھ کرتے۔'' چنانچہ اس جملے نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے لئے تازیانے کا کام دیا اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر ''دیوان غالب'' سے فال نکالی اور اس مرتبہ یہ شعر آیا ۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

۱۔ ''محاسن کلام غالب''، مشمولہ تنقید غالب کے سو سال'' ص ۱۲۳

گویا جواب ''مثبت'' میں آیا۔ اس وقت صرف ایک ماہ رہ گیا تھا لیکن اس مختصر مدت میں نہ صرف ڈاکٹر فرمان کو''نگار'' کے ''غالب نمبر'' کی انفرادیت کی پیشین گوئی ''دیوان غالب'' نے دی بلکہ مضامین کے انتخاب میں بھی رہنمائی کی جسے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے یوں محسوس کیا:

''تیرے پاس تو غالب نمبر کا بڑا قیمتی ساز و سامان موجود ہے، تو اس سلسلے میں بے وجہ پریشان ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق ''دیوان غالب ہی کی بدولت انہیں ''روح غالب'' کے سامنے سرخرو ہونے اور پرستارانِ غالب کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس طرح یہ مقالہ بالخصوص ڈاکٹر فرمان اور غالب کی قربت اور غالب سے ان کی محبت اور عقیدت کا ترجمان ہے۔

(۶)

''مولانا حامد حسن قادری مرحوم اور غالب شناسی'' کے زیرِ عنوان مقالہ ''نگار'' پاکستان کی نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے حامل اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مولانا حامد حسن قادری سے اپنی شناسائی کا ذکر کیا ہے جو مراسلے سے شروع ہوکر مکالمہ و ملاقات اور پھر عقیدت مندی تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''مولانا حامد حسن قادریؒ کی ادبی خدمات کا ''بقامت کہتر اور بقیمت بہتر'' کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری مولانا حامد کی وضع داری اور شخصی اوصاف میں حالی کی قربت کو بیان کرتے ہوئے بطور خاص مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں مولانا حامد، غالب کے

۱۔ ''دیوان غالب سے فال نکال سکتے ہیں'' مشمولہ ''نگار'' غالب نمبر جنوری و فروری ۱۹۶۹ء ص ۵

شاگرد خاص مولانا الطاف حسین حالی سے بھی کئی اعتبار سے مماثلت رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بیسویں صدی میں غالب شناسی کا محرک حالی کی ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) ہے، وہاں مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کا یہ حال ہے کہ حالی کی مانند

''غالب کا نام کیا آتا، گویا جام آجاتا اوران کے ہاتھ کی سب لکیریں رگِ جاں بن جاتیں۔'' (۱)

اسی عقیدت کی بناء پر مولانا حامد نے غالب پر اس وقت قلم اٹھایا جب ''یادگار غالب'' کے سوا اردو انگریزی میں کوئی کتاب یا مقالہ وجود میں نہ آیا تھا۔ اس کے علاوہ غالبیات کے حوالے سے مولانا نے غالب کے اردو فارسی دیوان سے اشعار کا انتخاب بعنوان ''غالب'' کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں یہ قابل قدر کام ہے کیونکہ یہ انتخاب ''دیوان غالب'' کے اس نسخے سے کیا گیا تھا جو غالب کی وفات سے پانچ (۵) سال پہلے ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا اور اس کے پروف بقول مولانا حامد حسن قادری خود غالب نے پڑھے تھے۔ (۲)

مذکورہ مقالے میں غالب اور کلام غالب سے مولانا حامد حسن قادری کی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ رباعی اور تاریخ گوئی پر مولانا کی توجہ خاص کے علاوہ مولانا حامد کی تضمین نگاری کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں تضمین نگاری کے ضمن میں مولانا حامد کی توجہ زیادہ تر غالب کی طرف رہی اور انہوں نے غالب کی بعض پوری غزلوں کی تضمین کی ہے اور ایک ایک مصرع کی بجائے تین تین مصرع لگائے ہیں۔ پیش نظر مقالے میں چند مثالوں کو بطور حوالہ نقل کر کے کلام غالب کے سلسلے میں مولانا حامد کی تضمین نگاری کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے کہ:

۱۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰

۲۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰

''یادگارِ غالب اور محاسن کلام غالب کے درمیانی عہد میں وہ غالب شناسی اور غالب فہم کا موثر ذریعہ خیال کی جاتی تھیں۔''(۱)

مولانا حامد کی تضمین نگاری کے بیان میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے شاہ دلگیر، مدیر ''نقاد'' کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے مئی ۱۹۱۴ء کے پرچے میں مولانا حامد کی تضمین نگاری کو سراہا۔

زیرِنظر مقالے میں مولانا حامد حسن قادری کا بطور غالب شناس یہ طرۂ امتیاز بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں غالب پر جو لکھا گیا (بشمول شرحین) ان کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور ان کے عیوب و محاسن پر بھی روشنی ڈالی لیکن وہ غالب کے طرف دار ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے کلام غالب سے زبان و معنی اور عروض و بیان کے معائب کو بھی تلاش کیا ہے اور اس پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہی وہ غالب کو قدیم غزل کے مجدّد اور جدید غزل کا محسن قرار دیتے ہیں۔(۲)

۱۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۳

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی بعض دوسری تحریروں کے لئے رجوع کیجئے:

(الف) غالب، ایک گم نام قطعہ، ''افکار نو'' کراچی، فروری ۱۹۶۱ء

(ب) غالب و سرسیّد، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء

(ج) غالب کی ایک غزل کے بارے میں استفسار کا جواب، ''نگار'' کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء

نواں باب

غالبیات سے متعلق ڈاکٹر فرمان کے تبصرے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''غالبیات'' سے متعلق بیسیوں کتابوں پر تبصرے کئے۔ یہ تبصرے ریڈیو سے نشر ہوئے یا ادبی رسائل بالخصوص 'نگار' کے صفحات کی زینت بنے۔ ان سے غالب شناسی کا دائرہ وسیع ہوا، پڑھنے والوں میں غالب فہمی کا شعور بڑھا اور خود صاحبِ کتاب کو ان تبصروں سے روشنی، راستہ اور بڑھاوا ملا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

تبصرے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''غالبیات'' سے متعلق بیسیوں کتابوں پر تبصرے بھی کئے۔ یہ تبصرے ریڈیو سے نشر ہوئے یا ادبی رسائل بالخصوص ''نگار'' کے صفحات کی زینت بنے۔۔۔ بہرصورت ان سے غالب شناسی کا دائرہ وسیع ہوا اور پڑھنے والوں میں غالب فہمی کا شعور بڑھا اور خود صاحبِ کتاب کو ان کے تبصروں سے روشنی اور بڑھاوا ملا۔۔۔ اگلے صفحات میں غالب سے متعلق کتابوں / رسالوں پر ڈاکٹر فرمان کے تبصروں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

''غالب اور دوسرے مضامین'' کے عنوان سے نظیر حسین زیدی ایم۔ اے کے ادبی مقالات کا مجموعہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔

نظیر حسین زیدی کے اس مجموعے میں کل سات (۷) مقالے ہیں جن میں سے دو غالب سے متعلق ہیں۔ یہ مقالے ان عنوانات کے تحت ہیں:

۱۔ غالب اور نواب حامد علی خاں
۲۔ سوانح غالب تاریخی اعتبار سے
۳۔ اسمٰعیل میرٹھی کے جدید رجحانات
۴۔ حالی کے ہم عصر
۵۔ حالی کی مثنوی
۶۔ اردو میں مکتوب نگاری کے عناصر
۷۔ اخبار رفیق ہند(۱)

۱۔ ''نگار'' کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری غالب کے حوالے سے نظیر حسین زیدی سے مذکورہ دو مقالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوانح غالب تاریخی اعتبار سے بہت طویل ہے اور غالباً اس کتاب کے نام میں غالب کا نام اسی وجہ سے شامل کیا گیا۔ زیدی صاحب کو اردو زبان و ادب سے خاص شغف ہے، ان کے مضامین موضوع کے اعتبار سے اچھوتے نہ سہی، ان کی دیدہ ریزی اور خوش ذوقی کا پتہ بہر طور دیتے ہیں۔ نظری مسائل کے خارزار سے بھی وہ نہیں الجھے بلکہ مختلف کتابوں کی مدد سے واقعات، سنین کے ساتھ درج کر دیئے ہیں۔ پھر بھی انہوں نے اس سلسلے میں اہم اور مستند مآخذ کو پیش نظر رکھا ہے اور ایسے کاموں میں جس جانفشانی و محبت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ صرف کی ہے۔''(۱)

(۲)

غالب پر کوثر چاند پوری کی محققانہ و ناقدانہ تحریروں کو مجموعہ، ۳۱۴ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے، ''جہان غالب'' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' کی اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں ''جہان غالب'' کے مطالعہ سے غالب کی شخصیت و شاعری کی ایک مکمل تصویر سامنے آتی ہے جو حالی (۲)، عبدالرحمٰن (۳)، شیخ اکرام (۴)،

۱۔ ''نگار'' کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء

۲۔ ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء)

۳۔ ''محاسن کلام غالب'' (۱۹۲۱ء)

۴۔ ''آثار غالب (۱۹۴۷ء)

غلام رسول مہر (۱) اور مالک رام (۲) کی پیش کردہ تصاویر سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر فرمان اس اختلاف کی توجیہہ جذباتی یا تاویلاتی سطح پر نہیں تلاش کرتے بلکہ یہ اختلاف واقعاتی و تحقیقی ہے جو غالب کے عقیدت مندوں کو فکر کی نئی راہیں دکھاتا ہے۔

''جہان غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''جہان غالب کے مقالات میں کوثر صاحب نے غالب کے کلام و سیرت پر جس انداز سے بحث کی ہے، وہ نہ صرف ادبی، بلکہ غالب کے باب میں تاریخی و سوانحی حیثیت سے بھی نہایت اہم ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ غالب کی زندگی و شاعری کے بعض اہم پہلوؤں کو واشگاف کیا ہے جو ہنوز پردۂ خفا میں تھے یا جن کے متعلق ہماری معلومات محدود و غیر مربوط تھیں۔ یقین ہے کہ غالبؔ کا یہ جائزہ، غالبؔ پر غور کرنے والوں کو نئے راستے سمجھائے گا اور ان کے کلام و بندگی کی تعبیرات کا ایسا باب کھولے گا جو کئی وجوہ سے اہمیت کا حامل ہوگا۔'' (۳)

(۲)

''احوال ونقد غالب'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب جسے محمد حیات خاں سیال نے مرتب کیا، نذر سنز لاہور نے جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی ستمبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کیا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

۱۔ ''غالب'' (۱۹۳۶ء)

۲۔ ''ذکر غالب'' (۱۹۳۸ء)

۳۔ ''نگار'' ''غالب'' (۱۹۶۶ء، ص ۷۸۔۷۹

''نگار'' اکتو

غالب کی شخصیت اور کلام میں پنہاں رموز و نکات کی بدولت غالب کی عظمت اور انفرادیت یہ ہے کہ ان پر تقریباً ڈیڑھ سو سال سے مختلف النوع موضوعات کی حامل تحریریں سامنے آ رہی ہیں لیکن ابھی بھی یہ سلسلہ اسی جوش و جذبہ سے جاری ہے اور قارئین غالب آج بھی غالب شناسی کے نت نئے رموز و نکات سے واقفیت کے متقاضی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق شاید اسی احساس کے تحت محمد حیات خاں سیال نے منتخب تحریروں کے ذریعے ایک ایسی جامع کتاب مرتب کی جسے غالب پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''احوال و نقد غالب'' کو غالب شناسی کے حوالے سے مفید قرار دیتے ہوئے حیات خاں سیال کی عرق ریزی اور جانفشانی کو سراہتے ہیں اور اس کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''انہوں نے کمال احتیاط سے غالب کی زندگی اور شخصیت کے سارے ایسے پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے جو غالب کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ پھر اس کی تشریح و تفہیم کے لئے ایسے مقالات انتخاب کیے ہیں جو ہر پہلو کو واشگاف کر کے قاری کے سامنے لے آتے ہیں اور قاری کے ذوق نقد و نظر کو سیراب کر جاتے ہیں۔''(۱)

(۴)

شاداں بلگرامی نے ''دیوان غالب'' کی شرح ''روح المطالب فی شرح دیوان غالب'' کے عنوان سے لکھی جس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' مارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں تبصرہ کرتے ہوئے اس کی جامعیت کو اس کی مقبولیت کا جواز قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کلام غالب کے شارحین کا حوالہ دیتے ہوئے شادان بلگرامی کی شرح کی انفرادیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

۱۔ ''نگار'' پاکستان۔ ستمبر ۱۹۶۷ء، ص ۷۵

''اس کی اہمیت یوں زیادہ ہو جاتی ہے کہ بعض قدیم شرحوں سے استفادہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ علامہ شادان بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں کو خصوصیت سے سامنے رکھا ہے اور جن پہلوؤں کو یہ حضرت تشنہ چھوڑ گئے تھے، انہیں تفصیل و تشریح سے سیراب کر دیا ہے، جہاں جہاں مطالب میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے، وہاں وہاں اول الذکر دونوں کی رائیں نقل کر دی ہیں اور بعد ازاں اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔ شاداںؔ صاحب نے یہ بھی کیا ہے کہ ہر شعر کے مفہوم کے ساتھ مشکل الفاظ و محاورات کے معنی بھی درج کر دیئے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ قاری کو لطف اندوز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ شرح کلام سے پہلے چونکہ اس کتاب میں ''تسامحات وزلات'' کے نام سے کلام غالب کی بعض بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں شرح کے ساتھ ساتھ تنقید کلام کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔''(۱)

(۵)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ایک فکر انگیز تصنیف ''فلسفہ کلام غالبؔ'' کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کو جون ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں اس کتاب کے تازہ ایڈیشن (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء) پر تبصرہ کیا ہے اور اسے نقش ثانی کہا جو نقش اول سے کئی اعتبار سے بہتر ہے کیونکہ یہ غالبؔ شناسی کی راہوں کو پہلے ایڈیشن کی نسبت کہیں زیادہ کشادہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری مذکورہ تصنیف کے دوسرے

۱۔ ''نگار'' مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۷۷

ایڈیشن کی خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سارے مباحث پر مصنف نے ازسرنو نظر ڈالی ہے۔ پہلے ایڈیشن پر مبصروں اور ناقدوں نے جو رائیں دی تھیں، ان سب کا مخلصانہ اور عالمانہ جائزہ لیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غالبؔ کی شخصیت وفن کے بعض ایسے پہلوؤں پر بحث کا اضافہ کیا ہے جو پہلے ایڈیشن میں نظرانداز ہو گئے تھے۔'' (۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں علم کلام، فلسفہ، مذہبیات، علم لسان اور بیان و بدیع پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کی گہری نظر نے ہی انہیں غالب کی روح تک پہنچنے میں مدد دی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے جس موضوع پر مذکورہ تصنیف میں لکھا، وہ ان پر پوری طرح واضح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بات کو مدلل بنا کر نہ صرف بیان کر سکے ہیں بلکہ زیر بحث موضوع کو دوسروں کے ذہن تک پہنچانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں یہی طرۂ امتیاز انہیں غالب شناسوں میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

(٦)

غالبؔ کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر ''غالبؔ ۱۸۶۹ء-۱۹۶۹ء'' کے حوالے سے یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کراچی نے ڈائری کی صورت میں مصوری، خطاطی اور حسن کلام غالب کا ایک قابل توجہ مرقع پیش کیا جس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' پاکستان کی جون ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس مرقع کو غالب کی صد سالہ برسی کے حوالے سے شائع ہونے والی سب چیزوں پر اس لحاظ سے فوقیت دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا حلقۂ اثر محدود ہے جبکہ:

۱۔ ''نگار'' جون ۱۹۶۹ء، ص ۷۸

''زیر نظر ڈائری اس نوع کی چیز ہے جو اپنی گوناگوں خوبیوں کے
سبب عام و خاص سب کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔اس کے ذریعہ غالب
کا نام اور کلام پاکستان سے باہر دوسرے ملکوں تک پہنچا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس ڈائری کو شعر و مصوری و فن خطاطی کا ایک قیمتی مرقع بتاتے ہیں جو مرتبین کی نفاستِ طبع، ذوقِ لطیف اور حسنِ سلیقہ کا آئینہ دار ہے۔ساتھ ہی اس تبصرے میں ڈائری کے مشمولات کا مختصراً جائزہ بھی لیا گیا ہے۔مثال کے طور پر اس میں غالب کے ہاتھ کی تحریر کا نمونہ، غالب پر اقبال کی مشہور نظم صادقین کے بنائے ہوئے تصویری مرقعے اور سب سے اہم یہ کہ پہلے ہی صفحے پر غالب کی ایک نظر گیر تصویر ہے۔ڈاکٹر فرمان کے مطابق.

''یہ تصویر غالبؔ کے مزاج، لباس، شکل و صورت، انداز
نشست و کتابت اور ماحول، سب کی ترجمان ہے۔اس تصویر
میں صرف سادہ لکیروں سے کام لیا گیا ہے لیکن اس خوبی کے
ساتھ کہ اگر کسی باذوق کے ہاتھ میں آ جائے تو سب لکیریں
ہاتھ کی رگ جاں بن جائیں۔''(۲)

(۷)

پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی کی نظموں کا مجموعہ جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، ''نذر غالب'' کے عنوان سے ''عظیم الشان بک ڈپو'' پٹنہ نے سفید کاغذ پر شائع کیا۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے لکھنے کے مطابق کتاب کے مشمولات یہ ہیں.

۱۔ غالبؔ بہ یک نگاہ
۲۔ غالبؔ اقبال کی نگاہ میں

۱۔ ''نگار'' جون ۱۹۶۹ء، ص ۹۷
۲۔ ''ایضاً''

۳۔ غالبؔ اپنے آئینے میں

۴۔ غالبؔ میری نظر میں

۵۔ غالبؔ کی فارسی غزل پر تضمین

۶۔ غالبؔ و غالب سخنداں

۷۔ غالبؔ برزمین غالب (۱)

مذکورہ عنوانات میں سے آخری عنوان ''غزلیات برزمین غالب'' کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

''آخرالذکر عنوان کے تحت عطا کاکوی کی انیس (۱۹) غزلیں ہیں۔ یہ غزلیں غالبؔ کی مشہور و مقبول زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ ہر چند کہ کسی استاد کی زمین میں غزل کہنا، خصوصاً غالبؔ جیسے ایجاز پسند و معجز بیان شاعر کی زمینوں کو ہاتھ لگانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں لیکن یہ غزلیں اپنے اندر کچھ ایسی دلکشی کا سامان رکھتی ہیں کہ ادب کا قاری غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ عطا کاکوی کی قادرالکلامی اور فکرِ رسا کا بھی قائل ہو جاتا ہے۔'' (۲)

(۸)

''غالب اور مطالعہ غالب'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصنیف رائٹر اکیڈمی لاہور سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس تصنیف پر ''نگار'' کی اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''غالب اور مطالعہ غالب'' کو غالب تحقیق و تنقید کی ایک

۱۔ ''نگار'' اگست ۱۹۶۹ء، ص ۷۹۔۸۰

۲۔ ''نگار'' اگست ۱۹۶۹ء، ص ۸۰

معیاری تصنیف قرار دیتے ہیں اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی غالب سے دلچسپی کی ذیل میں علی گڑھ میگزین کے ''غالب نمبر'' ۱۹۴۹ء میں شامل ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مضمون ''غالب کی عشقیہ شاعری'' (۱) کا حوالہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کی غالب کو ایک خاص زاویے اور انداز سے دیکھنے کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان مذکورہ تصنیف کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کتاب میں غالبؔ کی زندگی، شخصیت ماحول، تصانیف، شاعری، شاعری کی عظمت، خطوط کی ادبیت و اہمیت اور غالبؔ کے اہم ناقدین سب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ایسی تفصیل و توضیح کے ساتھ کہ غالبؔ کی زندگی اور فن کا ہر پہلو پوری طرح بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ سادگی اور وضاحت اور تجزیہ و تحلیل جس سے عبادت کا اندازِ تحریر عبارت ہے، اس کتاب میں بھی ہر ورق پر نمایاں ہے اور قاری کے آسودگیِ ذوق کا پورا سامان فراہم کرتا ہے۔'' (۲)

(۹)

''ہنگامۂ دل آشوب'' پہلی مرتبہ ۱۸۶۷ء میں کتابی صورت میں آئی۔ بعد ازاں اسے سید عطا حسین کے توسط سے جنوری ۱۹۳۷ء اور پھر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے غالب کے جشنِ صد سالہ (۱۹۶۹ء) کے موقع پر ایک مرتبہ پھر شائع کیا۔ اس اشاعت کے مرتب سید قدرت نقوی ہیں۔

''ہنگامۂ دل آشوب'' پر ڈاکٹر فرمان نے '' نگار'' کی ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان اپنے تبصرے

۱۔ ''علی گڑھ میگزین'' ''غالب نمبر'' بابت ۴۹۔۱۹۴۸ء، ص ۲۱۳۔۲۵۲

۲۔ ''نگار'' اگست ۱۹۶۹ء، ص ۸۷

میں لکھتے ہیں کہ جب غالب نے ''برہان قاطع'' کی رد میں ''قاطع برہان'' لکھی تو دونوں کتابوں کی تائید و تردید کا ایک طویل سلسلہ چھڑ گیا۔ چنانچہ ''برہان قاطع'' اور ''قاطع برہان'' سے متعلق ساری بحثوں کو کتابی صورت میں یکجا کر کے اس کا نام ''ہنگامۂ دل آشوب'' رکھ دیا گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری مذکورہ تصنیف کے متعلق اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

> ''کتاب فی نفسہٖ بہت اہم ہے لیکن کتاب کے مرتب سید قدرت نقوی نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ کتاب کے تعارف کے سلسلے میں ان کا بسیط مقدمہ اصل کتاب میں مذکورہ شخصیتوں کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور بعض امور و مسائل کے سلسلے میں ان کی توضیحات، ایسی چیزیں ہیں جو ایک طرف کتاب کی افادیت کو بڑھاتی ہیں تو دوسری طرف مرتب کی عرق ریزی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔''(۱)

(۱۰)

''نگار'' کی اکتوبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے عبدالرحمٰن بجنوری کی ''محاسن کلام غالب'' کے فخری ایڈیشن پر تبصرہ کیا ہے۔ فخری پرنٹنگ پریس کراچی نے، بجنوری کے اس مقدمے کو کتابی صورت میں ایک مفید اور خوبصورت ایڈیشن کی شکل میں پیش کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری غالب اور غالبیات کی تمام تصنیف اور تالیفات میں سے دو چیزوں کو غالب فہمی کے سلسلے میں اساسی اہمیت دیتے ہیں۔ ان میں ایک مولانا الطاف حسین حالی کی ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) اور دوسرا عبدالرحمٰن بجنوری کا مقالہ ''محاسن کلام غالب'' (۱۹۲۱ء) شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نزدیک تا حال ان کاوشوں کے

۱۔ ''نگار'' ستمبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۷

مقابلے کی کوئی کتاب اور کوئی مقالہ منظر عام پر نہیں آیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس تبصرے میں محاسن کلام غالب'' کے فخری ایڈیشن کی طباعت، ٹائپ، جلد بندی اور سرورق کی تزئین کو سراہتے ہوئے اس کی انفرادیت یہ بیان کرتے ہیں کہ:

''اس نسخے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو ہر طرح سے مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ رسالہ اردو، نسخۂ حمیدیہ اور دوسرے مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کے متن کی اصلاح کی گئی ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کتاب ''غلط نامہ'' کے بدنما داغ سے محفوظ ہو گئی ہے۔ یقین ہے کہ محاسن کلام غالب کا فخری ایڈیشن جسے مالکان فخری پریس کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی کڑی کہنا چاہیے۔ غالبؔ کے مداحوں میں خصوصاً اور ادبی حلقوں میں عموماً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔''(۱)

(۱۱)

''صحیفہ'' سہ ماہی کے ''غالب نمبر'' حصہ اول، دوم اور سوم پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' کی اکتوبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ''صحیفہ'' (سہ ماہی) نے ۱۹۶۹ء کی ساری اشاعتوں کو غالب کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء تک ''صحیفہ'' کے تین شمارے غالب نمبر حصہ اول، غالب نمبر حصہ دوم اور غالب نمبر حصہ سوم منظر عام پر آ چکے تھے جب کہ چوتھا زیر ترتیب تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''صحیفہ'' کے مذکورہ تین شماروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ''صحیفہ'' کو ان پرچوں میں شمار کرتے ہیں جو غالب اور غالبیات کے سلسلے میں لوح سے تمت تک ''دامن دل می کشد'' کے مصداق ہیں۔ ''صحیفہ'' غالب نمبر کے تین شماروں کی

۱۔ ''نگار'' اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۸

اہمیت کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس طور اجاگر کیا ہے:

''صحیفہ نے غالبؔ کی شخصیت اور فن کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش اس حد تک کامیاب ہے کہ دوسرے پرچوں کے لئے قابل رشک ہے۔ صحیفہ کے لکھنے والوں میں چونکہ بیشتر وہ لوگ ہیں جنہیں ماہر غالبیات کی حیثیت حاصل ہے یا وہ جنھوں نے برسوں کے مطالعہ کے بعد غالبؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی ہے۔ اس لئے مقدار و معیار، ہر لحاظ سے ''صحیفہ'' کے غالب نمبر، موضوع زیر بحث کے سلسلے میں مستند تاریخی دستاویز بن گئے ہیں۔'' (۱)

(۱۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے سہ ماہی اردو کے ۱۹۷۰ء کے شمارۂ اول میں ''رفتار ادب'' کے زیر عنوان سید وزیر الحسن کی مرتب کردہ تصنیف غالب ''پنج آہنگ'' پر تبصرہ کیا ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر جہاں ادیبوں اور دانشوروں نے اپنی اپنی سطح پر غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی، وہاں شریک غالب کی حیثیت سے مجلس یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی کا نام بھی سر فہرست ہے۔ اس مجلس نے جہاں غالب پر معتبر تنقیدی تصانیف کو شائع کیا وہاں غالب کی تصانیف اردو و فارسی کے مصدقہ متن، ضروری تعلیقات و حواشی اور مفید مقدمات کے ساتھ شائع کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا۔ ''پنج آہنگ'' جسے غالب کی فارسی نثر نگاری کا مجموعہ کہنا چاہئے، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو وزیر الحسن عابدی کی تصحیح و تدوین اور بسیط مقدمے کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری وزیر الحسن عابدی کو فارسی کا عالم خیال کرتے ہوئے ''پنج آہنگ'' جیسی فارسی کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ان کے انتخاب کو حد درجہ موزوں

۱۔ ''نگار'' اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۷

قرار دیتے ہیں جنہوں نے اس کام کو بڑی جانفشانی سے انجام دے کر غالب سے حق عقیدت ادا کیا۔

''پنج آہنگ'' میں غالب نے اپنی مختلف النوع فارسی تحریروں کو بالحاظ موضوع پانچ ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر باب 'آہنگ' کے نام سے موسوم ہے اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں اسی رعایت سے اس کا نام ''پنج آہنگ'' رکھا گیا ہے۔ ان ابواب کی تقسیم کچھ اس نوعیت کی ہے:

آہنگ اول: القاب وآداب اور ان کے لوازم سے متعلق ہے۔

آہنگ دوم: میں فارسی مصادر، افعال اور بعض اصطلاحات ولغات سے بحث کی گئی ہے۔

آہنگ سوم: ایسے منتخب اشعار پر مشتمل ہے جو باہم مراسلت میں کام آسکتے ہیں۔

آہنگ چہارم: میں غالب کی وہ فارسی تحریریں شامل ہیں جو انہوں نے اپنی یا دوسروں کی تصانیف کے لئے تقریظ، دیباچہ یا خاتمہ کے طور پر لکھی تھیں۔

آہنگ پنجم: میں مختلف مکتوب الیہم کے نام غالب کے فارسی خطوط ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''پنج آہنگ'' کی اہمیت کو اس طور بیان کرتے ہیں:

> ''کوئی شخص ''پنج آہنگ'' کو نظر انداز کر کے غالب کی قادرالکلامی و لغت شناسی، سخن فہمی و سخن طرازی، عقائد و افکار، نظریات و خیالات، معمولات و اشغال، زندگی کے نشیب و فراز اور شخصیت کے پیچ وخم کے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔''(۱)

ڈاکٹر فرمان بتاتے ہیں کہ عموماً غالب کے متعلق اردو مکتوب نگاری کے ضمن میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرسودہ القاب وآداب کو ۱۸۲۸ء سے ترک کیا لیکن

۱۔ ''سہ ماہی اردو'' شمارۂ اول ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۶۔۱۷۷

''پنج آہنگ'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسمی القاب و آداب اور پھر تصنع مخاطبے کی روش سے متعلق ۱۸۴۸ء سے بہت پہلے ۲۵۔۱۸۲۴ء ہی میں علی بخش رنجور کے ایماء پر لکھی گئی القاب و آداب کی آہنگ کی تمہید میں بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں۔ ''پنج آہنگ'' اسی قسم کے مزید مستند مآخذات کا پتہ دیتی ہے اور چونکہ اب یہ تصنیف غالب مجلس یادگار غالب کی وساطت سے نایاب سے دستیاب ہو گئی ہے، اس لئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے تبصرے میں امید کرتے ہیں کہ غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی نئی راہیں نکلیں گی۔

(۱۴)

''اِشاریۂ غالب'' کو سید معین الرحمن نے مُرتب کیا اور مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے ۱۹۶۹ء میں اسے شائع کیا۔ سیّد معین الرحمن کو ''اِشاریۂ غالب'' پر ۱۹۷۴ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام بھی عطا کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''اشاریۂ غالب'' پر ''نگار'' کی مئی جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔ غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر غالبیات کے سلسلے میں اتنا کام ہوا کہ اس کی نوعیت کا اندازہ لگانا اور اس کے معیار و مقدار کو یکجا کر کے اسے کتابی صورت میں مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن اس دیو قامت کام کو پروفیسر سیّد معین الرحمن نے تن تنہا انجام دیا اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق:

> ''اتنی جامعیت و خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس سے بہتر کی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' (۱)

برصغیر پاک و ہند میں بعض دوسرے ادیبوں نے بھی اس نوعیت کا کام کیا لیکن ان کے برعکس ڈاکٹر فرمان فتحپوری، سیّد معین الرحمن کے اس کام کو تحقیق و تنقید دونوں اعتبار سے معتبر قرار دیتے ہیں اور اس کی جامعیت کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے بقول:

۱۔ ''نگار'' پاکستان، مئی جون ۱۹۷۰ء، ص ۹۶

''یوں سمجھ لیجئے غالبیات کے سلسلے کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔آج تک غالب (کی تصانیف) کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے، وہ سب اس کتاب میں بالاختصار آ گیا ہے اور غالب (کی نگارشات) سے متعلق ہر قسم کی معلومات اس میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔''(۱)

(۱۴)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کراچی کی مئی جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں پروفیسر حمید احمد خاں کے مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' نسخۂ حمیدیہ (۱۹۶۹ء) پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ نسخہ مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور نے شائع کیا۔

''نسخۂ حمیدیہ'' دیوانِ غالب کا وہ خطی نسخہ ہے جو بھوپال کے کتب خانہ حمیدیہ میں دستیاب ہوا اور مفتی انوارالحق کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں پہلے پہل شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء میں تکمیل کو پہنچا جب کہ اس وقت غالب کی عمر ۲۴، ۲۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ نسخہ غالب کی شخصیت اور انداز کلام کی بہت سی ناکشادہ گرہیں کھولتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں'' دیوان غالب'' نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں کی اشاعت دو وجوہ کی بناء پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اول: نسخۂ حمیدیہ مرتبہ انوارالحق ایک مدت سے نایاب تھا اور اس سے استفادہ کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

دوم: مفتی انوارالحق کے نسخے میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جن کا ازالہ بہت ضروری تھا

اس توجہ طلب اور دشوار گزار کام کا متحمل ڈاکٹر فرمان کے خیال میں،

۱۔ ''نگار'' پاکستان، مئی جون ۱۹۷۰ء۔ ص ۹۶

حمید احمد خان جیسا صاحب قلم اور معتقد غالب ہی ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اہمیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ مفتی انوار الحق کے متن و ترتیب میں جو غلطیاں رہ گئی ہیں، پروفیسر حمید احمد خاں نے صرف یہی نہیں کہ وقت نظر کے ساتھ انہیں دور کیا ہے بلکہ ایک بسیط مقدمہ کے ذریعے نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اس میں طباعت وکتابت کی وہ کمزوریاں نہیں جو نسخۂ حمیدیہ کی اولین اشاعت میں نظر آتی ہیں۔''(۱)

(۱۵)

''نقوش'' غالب نمبر (حصہ دوم) مع (نو دریافت، بیاضِ غالب، بخط غالب) پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرے سے قطع نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے ایک مقالے بعنوان ''غالب ۔۔ نو دریافت بیاض کی روشنی میں''، اس مذکورہ دریافت کے حوالے سے غالب کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۷۱ء میں ''نقوش'' لاہور کے غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶ میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''نقوش'' کے غالب نمبر (حصہ دوم) کو غالب نمبر کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہونے والے تمام غالب نمبروں حتیٰ کہ ''نقوش'' کے غالب نمبر (حصہ اول) پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔

''نقوش''، غالب نمبر (حصہ دوم) میں شامل نو دریافت بیاض غالب کا یہ قدیم ترین نسخہ ہندوستان میں دریافت ہوا تھا جس کا غالب کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع

۱۔ ''نگار'' کراچی، مئی جون ۱۹۷۰ء، ص ۹۲

پر پاکستان پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا، لیکن محمد طفیل مدیر نقوش کی کاوشوں سے اس نسخے کی عکسی نقل حاصل ہوگئی ہے جسے محمد طفیل ''نقوش'' غالب نمبر (حصہ دوم) کی صورت میں بہت جلد منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ مدیر نقوش نے ایک صفحے پر اصل خطی نسخے کا عکس اور اس کے سامنے دوسرے صفحے پر متن کو نستعلیق میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں اس طریقے کی بدولت اصل نسخہ حد درجہ کارآمد ہوگیا اور اس طرح غالبؔ و کلامِ غالبؔ کے مطالعے کی نئی راہیں نکل آئیں۔

مذکورہ نسخے کی دریافت کی وضاحت کے ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مولانا امتیاز علی عرشی (۱) اور نثار احمد فاروقی (۲) کے مقالات کا حوالہ دیا ہے جو ''نقوش'' غالب نمبر (حصہ دوم) میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''نقوش'' کے اس نمبر کو محض ایک ''نمبر'' ہی نہیں خیال کرتے، بلکہ ان کے مطابق:

> ''موجودہ صورت میں نقوش کا غالب نمبر غالبیات کے سلسلے کی سب سے اہم اور قیمتی دستاویز ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔'' (۳)

(۱۶)

''غالب کون ہے؟'' کے زیرِ عنوان سید قدرت نقوی کی ۲۰۸ صفحات پر مشتمل تصنیف ۱۹۶۹ء میں ملتان سے شائع ہوئی جس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔

سیّد قدرت نقوی نے زیرِ تبصرہ کتاب میں ہر جگہ دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ اس کتاب کے مندرجات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

۱۔ ''نقوش'' غالب نمبر (حصہ دوم) مع (نو دریافت بیاض غالب، بخط غالب)، ص ۳۱۳ تا ۳۲۶

۲۔ ایضاً، ص ۹ تا ۴۸

۳۔ ''نگار'' ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۹۲

''زیرِ نظر کتاب سات مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین مضمون غالبؔ کی زندگی اور آخری چار غالبؔ کے فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مضمون صاحبِ کتاب کے علم و فضل اور قوت نقد و تحقیق کا مرقع ہے اور غالبؔ و کلام غالبؔ کے بعض ایسے گوشوں کو منور کرتا ہے جو اس سے پہلے دھندلے اور غیر روشن تھے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف غالبؔ کے طرفداروں بلکہ سخن فہموں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور صاحبِ کتاب کی بصارت و بصیرت کا سکہ بٹھائے گی۔''(۱)

(۱۷)

''ادب لطیف'' کا غالب نمبر جو ۱۹۶۹ء میں ناصر زیدی کی ادارت میں شائع ہوا، اس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کی جولائی اگست ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے:

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس تبصرے میں میرزا ادیب کے زیر ادارت ''ادب لطیف'' کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں کہ اس وقت ''ادب لطیف'' میں کسی کے نام کا چھپنا باعثِ فخر خیال کیا جاتا تھا لیکن میرزا ادیب کے بعد اور ناصر زیدیؔ سے پہلے کے عرصے میں اس پر زوال آ گیا لیکن ناصرؔ زیدی نے مذکورہ رسالے کو از سر نو زندہ کیا جس کی واضح مثال غالب کے جشن صد سالہ (۱۹۶۹ء) پر شائع ہونے والا ''ادب لطیف'' کا غالب نمبر ہے۔ مذکورہ خاص نمبر کو جن ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، ڈاکٹر فرمان نے تبصرے میں ان کو متعارف کر دایا ہے، یہ تقسیم کچھ اس طرح ہے:

۱۔ دروازۂ خاور کھلا	۲۔ رشکِ فارسی	۳۔ نقش ہائے رنگ رنگ
۴۔ ذکر اس پری وش کا	۵۔ پردۂ ساز	۶۔ گلِ نغمہ

۱۔ ''نگار'' پاکستان، کراچی، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۹۰

۷۔شوخیِ تحریر ۸۔حکایت خونچکا ۹۔بحضورِ غالب، اور
۱۰۔اس انجمن گل میں

اس تعارف کے علاوہ اس تبصرے میں چند ایک ابواب کے مشمولات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس رسالے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔مثلاً ابتدائی تین حصوں کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''غالب کی اردو، فارسی شاعری کا انتخاب ہے۔ایسا انتخاب، جس میں انتخاب کرنے والے کی رسوائی کا خطرہ نہیں ہے اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔''(۱)

مذکورہ غالب نمبر کے ابواب کے پیشِ نظر ڈاکٹر فرمان فتحپوری اسے رنگا رنگ خاص نمبر کہتے ہیں جسے اس کی رنگا رنگی ہی دوسرے غالب نمبروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(۱۸)

ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تالیف ''غالب اور انقلاب ستاون'' ۱۹۷۴ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی جسے ۱۹۷۴ء ہی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے داؤد ادبی انعام دیا گیا۔اس تصنیف سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' پاکستان کی جنوری فروری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نزدیک ''غالب اور انقلاب ستاون'' کے منظر عام پر آنے سے غالب کی زندگی اور فکر و نظر کے بارے میں ایسی باتوں کا انکشاف ہوا جو اس وقت تک غالب کے عام قاری ہی سے نہیں، غالب شناسوں سے بھی پوشیدہ تھیں۔

''غالب اور انقلاب ستاون'' کی بنیاد غالب کی اہم کتاب ''دستنبو'' پر قائم ہے جسے غالب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران روزنامچے کے انداز میں لکھا اور کچھ ایسے اسلوب خاص کو منتخب کیا کہ جس سے غالب، انگریز حکمران اور اپنے ہم وطنوں، دونوں

۱۔ ''نگار'' جولائی اگست، ۱۹۷۱ء، ص ۸۵

میں قابلِ قدر مقام حاصل کر سکیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''غالب اور انقلاب ستاون'' کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے:

''دستنبو'' کے حوالے سے غالبؔ کے متعلق اتنا قیمتی اور نیا مواد اس کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ جو لوگ غالبؔ کے ذہن کو فی الواقع پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔۔۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ''دستنبو'' کے مطالب و مباحث تک عام و خاص سب کی رسائی ہو گی اور غالبؔ کے بارے میں کئی ایسی باتیں سامنے آ گئیں جو صرف نئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے حیرت انگیز بھی ہیں۔ ''دستنبو''۔۔۔۔ کے نکات کو سمجھنا اور اس کے منظر و پس منظر پر وثوق سے گفتگو کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف چونکہ غالبیات کے پی ایچ ڈی ہیں اور غالب کا مطالعہ ان کی ادبی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا ہے، اس لئے وہ اس مشکل کام سے بہ آسانی گزر گئے ہیں اور غالب پر ایک ایسی کتاب دے دی ہے جو غالب کے سلسلے میں کئی کتابوں کی محرک بن سکتی ہے۔''(۱)

(۱۹)

''تحقیق غالب'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی کتاب ۱۹۸۱ء میں اردو اکیڈیمی سندھ کراچی نے شائع کی۔ ''تحقیق غالب'' اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے بارے میں کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے یہ الفاظ ثبت ہیں:

''غالبؔ پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ بظاہر کچھ اور لکھنے کی گنجائش نہیں ہے

۱۔ ''نگار'' پاکستان، کراچی، جنوری فروری ۱۹۷۵ء، ص ۶۳

لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تازہ تصنیف ''تحقیقِ غالب'' کے
مطالعے سے اندازہ ہوا کہ ابھی بہت کچھ لکھنا باقی تھا۔ حق یہ
ہے کہ ''تحقیقِ غالب'' کی معرفت مطالعۂ غالب کی نئی جہتیں
میسر آتی ہیں اور غالب اور فکرِ غالب کی بعض ایسی گرہیں کھلتی
ہیں جو ابھی نادیدہ و ناکشودہ تھیں۔''

مجھے، اپنے مقالے کی جمع و ترتیب کے ایام میں، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے ذخیرۂ غالبیات میں ''تحقیقِ غالب'' کے بارے میں ڈاکٹر فتح پوری کی اصل قلمی تحریر تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی۔۔۔۔ یہاں اس کا عکس محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس قلمی تحریر کا امتیاز یہ ہے کہ ''تحقیقِ غالب'' کے فلیپ پر، اس تحریر کا صرف ایک حصہ چھپا ہے۔

غالب پر اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ بظاہر کچھ اور کہنے کی گنجائش
نہیں ہے لیکن
"کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں"
کے مصداق ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تازہ تصنیف
"تحقیقِ غالب" کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ ابھی بہت کچھ لکھنا
باقی ہے۔ حق یہ ہے کہ "تحقیقِ غالب" کی معرفت غالب اور
کلامِ غالب کی بعض ایسی گرہیں کھلتی ہیں جو ابھی تک نادیدہ و ناکشودہ
تھیں۔ [illegible]
ہے اپنی فکر و نظر کا بیشتر حصہ [illegible] غالب [illegible] صرف کیا ہے

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے غالبیات پر کام کر کے
پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ [illegible] تحقیقی
مضمون میں وہ کلام و حیاتِ غالب کے بارے [illegible]
"تحقیقِ غالب" کی معرفت انہوں نے غالب کی تہہ در تہہ اور
پیچ در پیچ شخصیت و کلام کی جن منزلوں تک رسائی حاصل
کی ہے وہ "گنجینۂ معنی کے طلسم" اور "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ"
کی دریافت کے [illegible]
کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس عرفان و ادراک
میں شریک ہو کر ادب کا ہر سچا قاری ایک طرح کی
طمانیت و مسرت محسوس کرے گا۔

[تحریر: ۳-اپریل ۱۹۸۱ء]

دسواں باب

مُتعارفات، مُتعلق بہ غالب اور ڈاکٹر فرمان

۔۔۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کی شناسائی کو فروغ عام دینے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔۔۔

ڈاکٹر انور سدید

۔۔۔غالبیاتی ادب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ایک خاموش خدمت، غالب شناسوں کے جواہر کو ازسرِنو سامنے لانا، گویا "نایاب کو دستیاب" بنانا بھی ہے۔انہوں نے "نگار" کے وسیلے سے نیاز فتحپوری، حسرت موہانی، یگانہ، ڈاکٹر خلیق انجم، صادقین اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے غالب سے تعلق کی نوعیت اور اہمیت کو اجاگر کیا، اور خوب کیا!

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

متعلق بہ غالب

تعارف

ڈاکٹر فرمان فتحپوری جہاں تحقیق و تنقید کے ذریعے اپنے متعدد مقالات اور ادبی نگارشات میں غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں، وہاں انہوں نے کئی غالب شناسوں کے جواہر بھی متعارف کروائے ہیں اور اس مقصد کے لئے ''نگار'' ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کے مختلف شماروں میں علامہ نیاز فتحپوری، مولانا حسرت موہانی، میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی، صادقین، آفتاب احمد ناں، مختار الدین احمد، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے غالب سے تعلق کی نوعیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ یہاں کچھ ایسے ''متعارفات'' کو زیر بحث لانا بے محل نہ ہوگا۔

(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے علامہ نیاز فتحپوری کی شرح دیوان غالب بعنوان ''مشکلات غالب'' کو نایاب سے دستیاب صورت دینے کی غرض سے اس کا نصف اول حصہ ''نگار'' اکتوبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع کر دیا اور پھر ''نگار'' جنوری ۱۹۹۴ء کے شمارے کو اول الذکر شمارے کا ضمیمہ قرار دیتے ہوئے اسے ''مشکلات غالب'' کے بقیہ نصف حصے پر محیط کر دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''مشکلات غالب'' کی اہمیت دو خاص پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں:

اول: اردو کے ایک عظیم شاعر غالبؔ کے کلام کی شرح ہے۔

دوم: بیسویں صدی کے ایک عظیم نقاد کی ترجمان ہے۔(۱)

۱۔ ''ملاحظات'' ''نگار'' اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۲

اسی بناء پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے اس اقدام کو غالب اور نیاز دونوں کی تفہیم میں مددگار خیال کرتے ہیں۔

(۲)

مئی ۱۹۹۵ء کا ''نگار'' علامہ نیاز فتحپوری اور مولانا حسرت موہانی سے متعلق ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مئی میں مولانا حسرت موہانی (۱) اور علامہ نیاز فتحپوری (۲) کی رحلت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق یہ دونوں غالبؔ کے شیدائی تھے اور دونوں نے کلام غالب کی شرح لکھی۔ اسی مناسبت سے مذکورہ شمارے میں مولانا حسرت موہانی (۳) اور علامہ نیاز فتحپوری (۴) دونوں کی شرحوں کے نمونے کے طور پر غالب کی متداولہ دیوان کی ۲۸ ویں غزل تک کی شرح کی گئی ہے۔ یہ شمارہ مولانا حسرت موہانی اور علامہ نیاز فتحپوری کی غالب فہمی کا عکاس ہے۔۔ یہ شمارہ، حسرت، نیاز اور غالب سے ڈاکٹر فرمان کی محبت کا مظہر بھی ہے۔

(۳)

''نگار'' جنوری ۱۹۹۲ء کا شمارہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نیاز فتحپوری کے ایک مقالے ''غالب کی فارسی شاعری'' (تقابلی مطالعہ ومحاکمہ) کے زیرعنوان شائع کیا ہے۔ یہ مقالہ غالب کی فارسی شاعری کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے خیال میں مذکورہ مقالہ فارسی شاعری میں غالب کے مقام ومرتبہ کو متعین کرتے ہوئے غالب کو اردو کے ساتھ ساتھ،

۱۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء

۲۔ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء

۳۔ ''شرح دیوان غالب''

۴۔ ''مشکلات غالب''

فارسی کا بھی عظیم المرتبت اور موثر شاعر ثابت کرنا ہے۔ اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''غالب کے اردو کلام کے حق میں جو کام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مقالے'' محاسن کلام غالب'' نے کیا تھا، وہی کام غالب کے فارسی کلام کے سلسلے میں نیاز فتحپوری کے اس مقالے نے کیا۔''(۱)

یہ مقالہ نیاز فتحپوری کی تنقیدی کتاب ''انتقادیات'' میں شامل ہے۔

(۴)

''نگار'' کا ۱۹۸۷ء کا سالنامہ ''غالب نمبر'' مطالعاتِ غالب سے متعلق نیاز فتحپوری کی تحریروں پر مشتمل ہے۔

غالب پر علامہ نیاز فتحپوری کی کوئی تالیف یا کتاب نہ ہونے کے باعث عام رائے یہ تھی کہ نیاز کو غالب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر ہے بھی تو صرف اس قدر کہ وہ غالب کو مومن سے کمتر درجے کا شاعر خیال کرتے تھے کیونکہ علامہ نیاز فتحپوری نے ۱۹۲۸ء میں ''نگار'' کا مومن نمبر شائع کیا تو اپنے مقالے کا آغاز اس طور پر کیا:

''اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو بلا تامل کہوں گا کہ مجھے کلماتِ مومن دے دو اور باقی سب اٹھا کر لے جاؤ۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری مذکورہ غالب نمبر میں علامہ نیاز فتحپوری کے غالب سے تعلق خاطر کو ان کی مختلف تحریروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں ۱۹۳۲ء کا ''نگار''،

۱۔ ''نگار'' جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۶۔۷

۲۔ ''ملاحظات''، ''نگار''، نومبر ۱۹۸۷ء (سالنامہ) غالب نمبر

''غالب کی شوخیاں'' نمبر، اگست ۱۹۴۳ء کے ''نگار'' میں شامل نیاز فتحپوری کا معرکہ آرا مضمون ''نقش ہائے رنگ رنگ'' اور نیاز فتحپوری کی شرح دیوانِ غالب بعنوان ''مشکلاتِ غالب'' شامل ہے۔

علامہ نیاز فتحپوری کی غالب شناسی کے حوالے سے عام خیال اور مغالطے کو دور کرنے کی غرض سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' ۱۹۸۷ء (سالنامہ) ''غالب نمبر'' میں ان تحریروں کو محفوظ کر دیا جو غالبؔ کے فکر و فن کے سلسلے میں نیاز فتحپوری نے لکھیں۔

(۵)

''نگار'' اپریل ۱۹۹۴ء کا شمارہ میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی سے متعلق ہے۔ یگانہ اردو غزل کی تاریخ میں یکسر منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور غزل میں ان کا لہجہ اور اسلوب ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق سودا، آتش اور غالب کے لہجے کا سراغ دیتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں یگانہ کی مشہور کتاب ''غالب شکن'' کے پہلے ایڈیشن کو شائع کیا ہے۔

''غالب شکن'' حقیقتاً اپنی ابتدائی صورت میں ایک قدرے طویل خط تھا جو ۱۹۳۳ء میں مسعود حسن رضوی کے نام یگانہ نے لکھا تھا، پھر ۱۹۳۴ء میں اسے چھوٹی تقطیع کے بتیس (۳۲) صفحات میں بصورت کتابچہ شائع کر دیا تھا۔

''غالب شکن'' کا دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

ڈاکٹر نجیب جمال نے اس دوسرے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر اسے اپنے گراں قدر مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ اضافہ شدہ ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) دستیاب ہے لیکن پہلا ایڈیشن چونکہ بہتوں کی نظر سے ہنوز اوجھل ہے، چنانچہ اس ایڈیشن کو عام کرنے کی غرض سے ''نگار'' کے اپریل ۱۹۹۴ء کے شمارے میں پہلے ایڈیشن کی فوٹو کاپی ڈاکٹر نجیب جمال کے تفصیلی مضمون کے ساتھ شائع کی گئی تھی، جو میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی کی غالب پر تحقیق و تنقید کی نوعیت کو واضح کرتی ہے۔

(۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ''غالب کی شرحیں'' کے عنوان سے آفتاب احمد خاں کے مضمون کو متعارف کروایا ہے۔

مذکورہ مضمون میں آفتاب احمد خاں نے غالبؔ کے اس ادّعا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے اس کے جواز میں ''دیوان غالب'' کی شرح نویسی کا حوالہ دیا ہے۔ شرح نویسی کا یہ سلسلہ حیات غالب سے لے کر آج تک قائم ہے۔ غالب کی مکمل یا جزوی شرحوں کے حوالے سے آفتاب احمد خاں نے پچاس (۵۰) سے زائد شرحوں اور ان کے شارحین کے نام اپنے مقالے میں درج کئے ہیں۔ اس حوالے سے مقالہ نگار نے کلامِ غالب پر ایسی تصنیفات کا بھی حوالہ دیا ہے جو دیوانِ غالب کی منظوم شرح کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ''دستِ زرفشاں'' پر تبصرے کا حوالہ دیا گیا ہے کہ:

''صبا اکبر آبادی نے بھی دیوان غالب کی مکمل تضمین کی ہے لیکن یہ ابھی طباعت و اشاعت کی منتظر ہے۔''(۱)

(۷)

''نگار'' پاکستان کا اکتوبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں غالب پر ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون ''دشمنانِ غالب اور غالبؔ'' بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تفہیم و تحقیق غالبؔ کے سلسلے میں کئی اعتبار سے فکر انگیز اور توجہ طلب قرار دیتے ہیں۔ اردو ادب میں چونکہ بت پرستی کی روایت عام

۱۔ ''کلام غالب کی شرحیں'' مضمون نگار: آفتاب احمد خاں، مشمولہ ''نگار'' فروری ۱۹۸۷ء، ص ۱۶

ہے اور غالب کے سلسلے میں بھی مروج ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس روایت کے قائل نہیں۔ وہ حقائق کو سامنے لانے پر زور دیتے ہیں اور اسی حوالے سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے مضمون کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے پہلی بار اس طرف توجہ کی ہے اور نہایت مدلل انداز میں اہل نقد ونظر کو کم سے کم غالب کے سلسلے میں راہ اعتدال اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔''(۱)

''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''انداز گفتگو کیا ہے؟'' شامل کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مضمون ''کلام غالب میں استفہام'' کو بھی اسی شمارے میں شامل کیا کیونکہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں غالب پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مذکورہ مضمون اور ''کلام غالب میں استفہام'' کے درمیان توارد ذہنی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ (۲) اس مماثلت کے پیشِ نظر عاصمہ اعجاز نے بھی اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

> ''شمس الرحمٰن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ایک معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' (مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور عاصمہ اعجاز کی اس رائے کی تائید ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے بھی کی ہے۔ (۴)

۱۔ ''نگار''، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۷

۲۔ ''نگار''، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۵

۳۔ ''غالب نامہ'' تجزیاتی مطالعہ تھیسس، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۳ء

۴۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی'' مشمولہ ''نقوش غالب'' از سیّد معین الرحمٰن، ص ۲۵۹

چنانچہ ڈاکٹر فرمان نے اسی نکتے کے جواز میں اپنے اور شمس الرحمن فاروقی کے مضمون کو مذکورہ شمارے میں ایک ساتھ شائع کیا ہے۔

(۸)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' پاکستان کی اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر اسلم پرویز کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر'' مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی کو متعارف کروایا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں یہ کتاب بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور شاعری کو پہلی مرتبہ پوری آب و تاب اور صداقت و حقائق کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی زندگی غالب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔اس تعلق کو بھی مذکورہ تصنیف میں بیان کیا گیا ہے۔غالب، بہادر شاہ ظفر کے استاد تو ذوق کی وفات کے بعد ہوئے لیکن قلعۂ معلیٰ سے ان کا تعلق اس سے پہلے ہی قائم تھا۔

۱۲ جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے غالب کو ''نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، کے خطابات عطا کئے اور باقاعدہ ملازمت دے کر انہیں فارسی زبان میں خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا۔۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال کے بعد شاہ ظفر، مرزا غالب سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا جس کے بعد بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دیئے گئے۔(۱)

ڈاکٹر اسلم پرویز نے ''بہادر شاہ ظفر'' کے اساتذہ کے ضمن میں یہ واضح کیا ہے کہ ظفر کی شاعری پر شاہ نصیر، ذوق اور غالب کا اثر نسبتاً زیادہ تھا اور انہی اثرات نے ظفر کے مذاقِ سخن کو نکھارا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا ڈاکٹر اسلم فرخی کی تصنیف ''بہادر شاہ ظفر'' کو متعارف کروانے کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اور غالب کے تعلق کے حوالے سے غالب کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

۱۔ ''نگار''، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۲

(۹)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' پاکستان کی فروری ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں مختار الدین احمد کے بارے میں اہم معلومات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں مختار الدین احمد کی ایک وجہ شہرت بطور غالب شناس بھی بتائی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر مالک رام کی مرتبہ کتاب ''نذر مختار'' سے مقالات کا انتخاب بھی کیا گیا ہے جن میں سے ''تصنیف و تالیف'' کے زیرِ عنوان مختار الدین احمد کی تصانیف میں غالب پر ان کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

غالب سے متعلق ان کے ادبی، علمی اور تحقیقی مضامین ''غالب نامہ'' کی زینت بنے۔ اس کے علاوہ مختار الدین احمد نے بعض رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں جن میں مالک رام نے ''علی گڑھ میگزین'' ۱۹۴۸۔۱۹۴۹ء کے ''غالب نمبر'' کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔(۱) جس کو بعد ازاں حذف و اضافے کے ساتھ ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

مالک رام کی مرتبہ ''نذر مختار'' کے علاوہ اسلوب احمد انصاری بھی ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں شامل اپنے مضمون ''مختار الدین احمد، ایک دوست'' میں ان کا ذکر بطور غالب شناس کرتے ہیں اور مختار الدین احمد کی تصنیف ''احوال غالب'' میں غالب کے معرکتہ الآرا خاکے کو ایک تخلیق کا درجہ دیتے ہیں۔(۲)

مندرجہ بالا مشمولات کے پیش نظر ''نگار'' پاکستان کا فروری ۱۹۸۹ء کا شمارہ مختار الدین احمد کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات کے ساتھ ان کی غالب شناسی کا احاطہ کرتا ہے۔

۱۔ ''نگار'' پاکستان فروری ۱۹۸۹ء، ص ۳۳

۲۔ ''نگار'' پاکستان فروری ۱۹۸۹ء، ص ۶۴

(۱۰)

''نگار'' جولائی ۱۹۹۲ء کا اداریہ ''تصوف اور غالب'' کے عنوان سے ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کے کلام میں تصوف کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے سید محمد مصطفیٰ صابری کی تصنیف ''غالب اور تصوف'' کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اور ساتھ ہی اس شمارے میں اس تصنیف کے چند اجزاء کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ غالب شناسی کا سلسلہ حیاتِ غالب سے تا حال جاری ہے بلکہ زیادہ جوش وخروش سے رواں دواں ہے۔ اس کی وجہ بلاشبہ غالب کی شخصیت اور شاعری کے حیرت انگیز نکات و رموز ہیں۔ البتہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اس ادّعا:۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ان کی نظر میں تصوف کے حوالے سے سید محمد مصطفیٰ صابری کی کتاب ''غالب اور تصوف'' قابلِ ستائش ہے۔ اس تصنیف کی اہمیت وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''صابری صاحب تصوف اور شاعری دونوں کے شناور معلوم ہوتے ہیں۔ تبھی انہوں نے اپنے موضوع سے ہر طرح انصاف کیا ہے اور غالب آگاہی کے ساتھ ساتھ تصوف کا ثبوت بھی دیا ہے۔''(۱)

گویا ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے سید محمد مصطفیٰ صابری کے غالب سے تعلق کی نوعیت کو متعارف کروایا ہے۔

۱۔ ''ملاحظات'' مشمولہ ''نگار'' شمارہ جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۴

(۱۱)

''نگار'' کا فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے کا اداریہ ''غالب کے خطوط'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں غالب کو عظیم شاعر کے ساتھ عظیم نثر نگار بھی بتایا گیا ہے۔ غالب کی نثر جو ان کے خطوط پر مشتمل ہے، انہیں اردو کی عام نثری تاریخ میں بحیثیت صاحب طرز نثر نگار نہایت بلند و ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کی ترتیب و تدوین کی طرف بہت سے اہل علم نے توجہ دی۔ ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کا نام ایک معتبر مقام رکھتا ہے۔ ''نگار'' کے اس شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ ''غالب کے خطوط'' کے تنقیدی ایڈیشن کا تعارف کروایا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا تعارف اور ان کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری تحقیق و تنقید دونوں میں ان کے قلم کو رتبۂ اعتبار دیتے ہیں اور دو موضوعات کو ان کی خاص دلچسپی کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ایک غالب اور دوسرے متنی تنقید۔ ان دونوں دلچسپیوں کا بھرپور اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے ''غالب کے خطوط'' کے تنقیدی ایڈیشن میں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں غالب کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس اداریئے میں غالب کے خطوط کے پہلے ایڈیشنوں کی خصوصیات اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور پھر ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ تنقیدی ایڈیشن کے امتیازات کو نمایاں کر کے ان کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔

خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کا یہ کام ڈاکٹر خلیق انجم نے کم و بیش پانچ سو صفحات کی چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا ہے، اس کی جلد اول کے متعلق ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''جلد اول کا تحقیقی و تنقیدی مقدمہ سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے
> گویا ''خطوط غالب'' پر ایک مکمل کتاب ہے۔''(۱)

''نگار'' کے اس شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے ''غالب کے خطوط'' مرتبہ ڈاکٹر

۱۔ ''ملاحظات'' مشمولہ ''نگار'' فروری ۱۹۸۸ء، ص ۴

خلیق انجم، جلد اول کے مقدمے کا صرف ایک جزو متعارف کروایا ہے جس کا تعلق خطوط غالبؔ کے مختلف ایڈیشن، املا کی خصوصیات اور بعض الفاظ کے استعمال سے ہے۔

مذکورہ مشمولات کے پیشِ نظر ''نگار'' فروری ۱۹۸۸ء کا شمارہ بلاشبہ ڈاکٹر خلیق انجم کی غالب شناسی کا اعتراف اور عکاس ہے۔

گیارہواں باب

بطور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مقام و مرتبہ

فرمان صاحب نے غالب کو ''شاعر امروز و فردا'' کہہ کر محض تحسین و توصیف کا رسمی فریضہ ادا نہیں کیا۔۔کسی شاعر کو بیک وقت شاعرِ امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے۔۔فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعرِ امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی شکل دی ہے۔۔بالکل شخصی سطح پر فرمان صاحب نے غالب کو ایک بطلِ عظیم کے پیکر میں بھی دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انہیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انہوں نے پوری طرح فراخ دلی سے داد دی ہے۔اس کے باوجود فرمان صاحب کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست بُرد سے محفوظ رہا ہے۔

پروفیسر سید وقار عظیم

فرمان صاحب ہمیشہ سے غالب پرستی اور غالب کے طرف دار ہیں لیکن اعلیٰ ذوق شعر رکھنا اور غالب کی طرف داری کرنا دونوں ایک ہی بات ہے۔فرمان صاحب نے غالب کی جتنی گرہیں کھولی ہیں، وہ واقعی ہمارے جیسے طالب علموں کی صحیح قسم کی غالب فہمی کی طرف اشارہ ہیں۔

سید سجاد باقر رضوی

--

مقام ومرتبہ

ڈاکٹر فرمان فتحپوری عہد حاضر کے نامور اہل قلم اور دانشور ہیں جو بطور خاص ایک نقاد، محقق، مورخ، ادیب، شاعر، انشاء پرداز، مقرر اور مبصر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں گویا ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایک پہلو دار اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ اس متنوع شخصیت کا ایک زاویہ تحقیق و تنقیدِ غالب کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے جو بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔

تنقید غالب سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا پہلا دستیاب مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے زیر عنوان مئی ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں کلام غالب میں کلماتِ استفہام کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی انفرادیت کے پیش نظر اسے غالب پر اوریجنل مضمون خیال کرتے ہوئے غالب کی صدسالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر سید فیاض محمود اور اقبال حسین کی مرتبہ تصنیف ''تنقید غالب کے سوسال'' میں شامل کیا گیا۔ بعد ازاں یہ ۱۹۷۰ء میں غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی پہلی کتاب ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کی زینت بنا۔

اس مقالے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد معین الرحمن لکھتے ہیں:

> ''کلام غالب کے استفہامیہ لب ولہجہ کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور وفکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے چراغ روشن کیا۔''(۱)

۱۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی'' مقالہ نگار ڈاکٹر سیّد معین الرحمن، مشمولہ نقوش غالب، ص ۲۵۹

مذکورہ مقالہ ادبی حلقوں میں غالب کے حوالے سے ان کی پہچان بنا دگر نہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اپنے ایک بیان کے مطابق تفہیم غالب کا شوق انہیں بچپن سے تھا اور اسی والہانہ محبت کے نتیجے میں انہیں مکمل دیوان غالب بچپن میں ہی یاد ہو گیا تھا۔(۱)

''غالب کے کلام میں استفہام'' کے بعد ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے غالب سے متعلق متعدد تنقیدی، تحقیقی اور نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نوعیت کے حامل مقالات مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے اور غالب سے ان کی عقیدت اور لگاؤ علمی اور ادبی حلقوں خصوصاً معتقدین غالب پر آشکار ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عہد حاضر میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا شمار ممتاز غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمن کے خیال میں:

> ''خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے بارے میں فرمان صاحب ہنوز برابر سوچ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں اور ان کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے۔''(۲)

غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی دو مستقل تصانیف ''غالب شاعر امروز و فردا'' (۱۹۷۰ء) اور ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' (۱۹۹۵ء) کے زیرِ عنوان منظر عام پر آئی ہیں جن کی بدولت ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو بطور غالب شناس بلند مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔

''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں شامل ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مقالہ بعنوان ''کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار'' اپنے موضوع کے اعتبار سے غالبیات میں نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے جسے ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے شعور و لاشعور کا

۱۔ ''ہمکلامی کا شرف'' مقالہ نگار خان ظفر افغانی مشمولہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، (حیات و خدمات) جلد دوم ص ۶۹۸

۲۔ ''ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی'' مقالہ نگار، ڈاکٹر سیّد معین الرحمن، مشمولہ ''نقوش غالب'' از ڈاکٹر سیّد معین الرحمن، ص ۲۶۲

حاصل اور ایک طرح سے القائی انکشاف وتنقید کا جز و خیال کرتے ہیں۔(۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کو رسالہ ''نگار'' (پاکستان) کے مختلف شماروں اور سال ناموں کے حوالے سے بھی غالب کے پڑھنے والوں کے لئے تازہ رکھا اور اس ضمن میں ان کا غالب سے متعلق ایک غیر مرتب مقالہ بعنوان ''دیوان غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں'''' نگار'' (پاکستان) کے ''غالب صدی نمبر'' جنوری فروری ۱۹۶۹ء کا اداریہ ہے۔ یہ مقالہ ایک آپ بیتی کی حیثیت رکھتا ہے اور ''دیوان غالب'' سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ذاتی تاثرات کا غماز ہے۔ مذکورہ مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری ''دیوان غالب'' سے اپنی عقیدت کا اظہار غالب کے اس شعر سے کرتے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی حوالے سے سید وقار عظیم کہتے ہیں:

''غالب کے کلام سے اپنے ذاتی اور شخصی رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فرمان صاحب نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا ہے کہ وہ غالب کی نبوت شعری پر ایمان رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر اسے اپنا رہنما اور مشکل کشا سمجھتے ہیں۔'' (۲)

یہی تاثر مذکورہ مقالے میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب پر دو مستقل تصانیف اور غیر مرتب مقالات کے علاوہ مختلف کتابوں پر تبصرے بھی ان کی غالب شناسی کے عکاس ہیں۔ یہ تبصرے بطور غالب شناس نہ صرف ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے فکر وفن کے نئے زاویوں اور ارتقاء کی انوکھی منزلوں

۱۔ ''کتاب سے پہلے'' مشمولہ ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ص V

۲۔ ''غالب: شاعر امروز و فردا'' تبصرہ نگار: سید وقار عظیم مشمولہ ''نقوش'' غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، ۱۹۷۱ء، ص ۶۰۳

کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ان راستوں کا تعین بھی کرتے ہیں جو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے قربِ غالب کے واسطے اختیار کیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بجائے خود یہ تبصرے ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

''غالب پسندی'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں کہ:

''غالب کا بے مثل ہونا بھی اس کی ایک خوبی ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔''(۱)

اپنی رائے کی توجیہہ وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''غالب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بہت بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ اس مضمون کا ہر پہلو سمجھ میں آ جاتا ہے۔''(۲)

غالب شناسی کی یہی لگن ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے علمی اثاثے میں ''شرح دیوان غالب'' کے خوش آئند اضافے کا باعث بنی جو بہت جلد طباعت کے مرحلوں سے گزر کر معتقدینِ غالب کے زیرِ مطالعہ اپنا مقام و مرتبہ متعین کرے گی۔ یہ شرح اس اعتبار سے ''اپنی مثال آپ'' کے مترادف ہے کہ اس کی تخلیق کے دوران ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے پاس ماسوائے ''دیوان غالب'' کے اور کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے استفادہ ممکن ہوتا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی غالب فہمی کے باعث مکمل شرح دیوان غالب صرف دو (۲) ماہ پانچ (۵) دن کا حاصل اور ہاتھ سے کاغذ پر لکھے ہوئے چار سو (۴۰۰) صفحات پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی رائے میں:

> ''آج کے طالب علموں کو کچھ باتیں ضرور ایسی فراہم کرے گی جو ان کے لئے فائدہ مند ہوں گی۔''(۳)

۱۔ مقالہ نگار سے مکالمہ: مورخہ ۱۸، اپریل ۱۹۹۶ء

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اپنی نگارشات جہاں ان کی غالب شناسی کی عکاس ہیں، وہاں انہوں نے متعدد غالب شناسوں کی تصانیف متعارف کروا کر غالب کو مقبولِ عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مقصد میں ''نگار'' ایک اہم وسیلہ ثابت ہوا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کو رسالہ ''نگار'' کے مختلف شماروں اور خاص نمبروں کے حوالے سے بھی پڑھنے والوں کے لئے تازہ رکھا۔۔۔ ''نگار'' کے مختلف شماروں میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا حسرت موہانی، میرزا واجد حسین یاس ویگانہ چنگیزی، صادقین، آفتاب احمد خاں، مختار الدین احمد، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی تنقید غالب سے متعلق کاوشوں کو منظرِ عام پر لائی ہے جن سے بلاشبہ غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے نئے در کھلتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے علمی و ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی تنقید و تحقیق کے جوہر مختلف اصناف اور شخصیات کے ضمن میں اجاگر کئے اور ہر تصنیف کی داد اہل علم و اہل بصیرت سے پائی۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بارے میں خلیق انجم کے یہ الفاظ بہت بجا ہیں کہ:

> ''وہ اعلیٰ درجے کے محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ حالانکہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ محقق ایک اچھا نقاد نہیں ہوتا۔ اسی طرح نقاد بھی بہت اچھا محقق نہیں بن پاتا لیکن فرمان صاحب نے دونوں میدانوں میں اختصاص پیدا کیا ہے۔'' (۱)

تنقید و تحقیق کے انہی اوصاف کی بدولت ڈاکٹر فرمان فتحپوری، تنقیدِ غالب کے سلسلے میں بلاجواز غالب کے گن نہیں گاتے بلکہ اپنے نقطۂ نظر کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر مدلّل

۱۔ ''فرمان فتحپوری، تحقیق و تنقید کے شہسوار'' مقالہ نگار: ڈاکٹر خلیق انجم۔ مشمولہ: ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات) ترتیب و تدوین: امراؤ طارق، جلد اول، ص ۲۳۶

انداز میں قابلِ اعتبار بناتے ہیں۔

غالب سے متعلق مذکورہ تمام کاوشوں کی بناء پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس علمی و ادبی حلقوں میں ہمیشہ بلند و ممتاز نظر آئیں گے۔ سید وقار عظیمؔ نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ:

> ''غالب کے کلام کے مطالعے سے قاری جن جن نازک تجربات سے گزرتا ہے، انہیں ادراک سے اظہار میں منتقل کرنے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بلاشبہ فرمان فتح پوری کی تنقید اس قابلِ رشک سعادت کی حصہ دار ہے۔''(۱)

۱۔ ''غالب: شاعر امروز و فردا'' تبصرہ نگار۔ سید وقار عظیم، مشمولہ ''نقوش'' غالب نمبر۳، شمارہ ۱۱۶، ۱۹۷۱ء، ص۲۰۴

ضمیمہ اول

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب

"غالب، شاعر امروز و فردا"

تحریر:

سید وقار عظیم

مطبوعہ:

(نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، سال ۱۹۷۱ء)

''غالب: شاعر امروز و فردا''

وقار عظیم

غالب کی سویں برسی گذر چکی لیکن اس کی آمد آمد کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی، اس کا زور اب تک نہیں تھما۔ تحقیق و تنقید نے اس عظیم انسان اور عظیم شاعر کی عظمت کے اعتراف کے جو منصوبے بنائے تھے، ان کی تکمیل کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد غالب پر کوئی نہ کوئی تحقیقی، تنقیدی یا ملی جلی تحقیقی و تنقیدی کتاب شائع ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کا یہ صدقہ جاریہ یوں ہی جاری رہے گا اور خدا کرے کہ جاری رہے کہ غالبؔ کے فکر و فن کی تازگی اور ہمیشگی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اس صدقہ جاریہ کی تازہ ترین صورت ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مضامین کا مجموعہ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ہے۔ اس مجموعے میں پندرہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا، جانچا اور پرکھا گیا ہے اور فن اور فنکار دونوں کی ایسی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے خد و خال موزوں اور متناسب ہوں اور رنگ و آہنگ دل آویز اور جاذبِ نظر۔ یہ منصب جس سلیقے اور انداز سے ادا کیا گیا ہے، اس میں ہر جگہ تازگی و شگفتگی ہے اور پڑھنے والا ہر مضمون پڑھ کر، یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ غالبؔ کے کلام کا مرتبہ و مقام یہ ہے کہ اس میں اب بھی تاویل و توجیہہ کے نئے نئے رخ نکل سکتے ہیں۔۔۔ بشرطیکہ غالبؔ کے ساتھ مُحقق، مُبصر اور نقاد کا ذہنی اور جذباتی تعلق، زندگی بھر کی رفاقت، دمسازی، خلوص اور یگانگت کا نتیجہ ہو۔ یہ سب مضامین بقول مصنف، غالبؔ کی ہشت پہلو ذات، جامع الصفات شخصیت، صد

رنگ فن اور ہزار شیوہ ادبیت کی وکالت اور وضاحت کی غرض سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق نے منطق کی خوش استدلالی اور تنقید نے فلسفے کی خوش فکری کی مدد سے محقق اور نقاد کی راہ کو آسان بنایا ہے۔

غالب کے اولین تعارف نگار، غالب اور غالب تخلص کے اردو شعرا، غالب کے حالات میں پہلا مضمون، غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز، اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی ۔۔۔اور، غالب اور اقبال، غالب نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں اور غالب، شاعر امروز وفردا، نیم تحقیقی، نیم تنقیدی یا ملے جلے تحقیقی و تنقیدی مضمون ہیں۔ان مضامین کی بنیادی خصوصیت، میں نے منطقی خوش استدلالی کو بتایا ہے، اور منطق میں خوش استدلالی کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ آپ کی طرح میں بھی سیاستدانوں، وکیلوں، واعظوں اور مناظروں کے ہاتھوں منطق کی روایتی زبوں حالی کے افسانے سن چکا ہوں۔سوطرزِ استدلال نے زندگی کے ہر دور میں منطق کو الجھاوے ڈالنے اور مغالطے پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔منطقی مغالطوں کی جامہ دری سے محققوں کے دامن بھی محفوظ نہیں، اس لئے تنگ نظری اور سبک سری کو نیند ہی ان مغالطوں کی چھاؤں میں آتی ہے۔۔۔لہٰذا منطق، خوش استدلال نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور دیانت دارانہ تحقیق کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات، ان سب مضامین میں بدرجۂ اتم موجود ہے جن کے نام، میں نے ابھی لئے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں۔اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف، سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ قائم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب، کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔مقدمات، مفرد، ملتف اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقراء، استنباط اور استخراج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی، یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی

انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی ہیں جنہیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے ابھی ان تحقیقی مضامین کے سلسلے میں کیا، ان میں بڑی سبک رفتاری سے ابھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے۔ جو شوق اور تجسس کو ابھارتی، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزارتی ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لئے قابل قبول ہو۔ منطقی استدلال کا ایک اور وصف جوان سارے مضامین میں جاری و ساری ہے، اس کے لہجے کی ایسی متانت اور بردباری ہے جس نے شگفتہ روی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے۔ اس تحقیق نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔

مجموعے کے تنقیدی مضامین میں بدیہی طور پر تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کا وصف اس سے بھی زیادہ ہے جتنا تحقیقی مضامین میں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تحقیقی مضامین جس طرزِ استدلال کا مطالبہ کرتے ہیں، اس میں ذہنی عمل کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں تبصرے اور تحسین کے مرحلے، دل کی راہ سے طے ہوتے ہیں اور یہی فرق، تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کے مدارج میں فرق پیدا کرتا ہے۔

غالب کے کلام سے اپنے ذاتی اور شخصی رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فرمان صاحب نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا۔۔۔ کہ وہ غالب کی:

> ''نبوت شعری پر ایمان رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر
> اسے اپنا رہنما اور مشکل کشا سمجھتے رہے ہیں۔۔''

شاعر اور اس کے قاری کے باہم تعلق اور رشتے کی نوعیت اس حد تک جذباتی ہو کہ وہ اس کا پرستار بن جائے تو تعریف و توصیف میں اسے غلو اور اغراق کی حدوں سے گزر جانے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ کسی کو اس سے، اس کا یہ حق چھیننے کا اختیار نہیں۔ یہ اس کے دل کا معاملہ ہے اور دل کی شریعت اس خاص معاملے میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ چون و چرا کے عالمگیر ضابطے یہاں استعمال نہیں کئے جاتے۔۔۔ یہ سب کچھ

درست، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل کے معاملے والی بات، ہوتی بڑی ظالم ہے۔ اسے چھپا رکھیے تو دل ناسور بن جاتا ہے اور اسی لئے آدمی پر قانونِ قدرت کا جبر ہے کہ وہ دل کی بات کو باہر نکالے اور ساری دنیا کو اپنے درد کا ساتھی بنائے، یوں کہ دنیا اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے اور احساس میں مَن وتو کا فرق اور امتیاز باقی نہ رہے۔ جھگڑا یہیں سے شروع ہوتا ہے اور کیوں اور کیسے کے تیروں کی بوچھار سے کلیجہ چھلنی ہونے لگتا ہے۔ دل کے باہر کی دنیا، تعریف وتوصیف کے اسباب جاننا چاہتی ہے اور اپنے درد کو دنیا کا درد بتانے کی آرزو رکھنے والا انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر وکالت شروع کرتا ہے۔

اس وکالت کا پہلا مرحلہ محاسبۂ نفس ہے، یعنی اس بات کی جانچ، پرکھ اور تلاش کہ میں کسی کے حُسن کا پرستار اور فریفتہ کیوں بن گیا؟ جس دل والے کو اس بات کا صحیح جواب مل جائے، وہ نقاد ہے اور جو نقاد اس صحیح بات کو لفظوں کی مدد سے دوسروں کے دل میں اتار سکے، وہ اچھا نقاد۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے غالب کی محبت، شیفتگی اور پرستاری کا داخلی سفر انہیں مرحلوں سے گزر کر طے کیا ہے اور ان کی سلامتی طبع نے حُسن بیان کو اپنا رفیق بنا کر اپنے محسوسات کی پوری دنیا کو، دوسروں کے محسوسات کی دنیا تک پہنچا دینے کا معرکہ سَر کیا ہے۔ غالب کے کلام کے مطالعے سے قاری جن جن نازک تجربات میں سے گزرتا ہے، انہیں ادراک سے اظہار میں منتقل کرنے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بلا شبہ فرمان فتحپوری کی تنقید اس قابلِ رشک معلومات کی حصہ دار ہے۔

فرمان صاحب نے غالب کو شاعر امروز وفردا کہہ کر محض تحسین وتوصیف کا رسمی فریضہ ادا نہیں کیا۔ ان کی تحقیق اور تنقید روایتی آداب ورسوم کو محترم سمجھنے اور ان کی پیروی اور پابندی کرنے کے معاملے میں بڑی قدامت پسند ہے۔ لیکن قدامت پسندی کے اس میلان کو انہوں نے سوچ سمجھ کر اور اس سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو کر اختیار کیا ہے۔ کسی شاعر کو بہ یک وقت شاعرِ امروز وفردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیانی فصل وبعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس

میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ یہ جتنی تیز، جتنی دُور بیں اور جتنی دُور رس ہوگی، اسی حد تک شاعر کے فکر و تخیل اور جذبے میں رسائی کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جس کی بدولت وقت کی طنابیں کھینچ کر ماضی، حال اور مستقبل کو ایک نقطے پر لے آتی ہیں۔۔ آج کا شاعر ہر دور کے انسان کے جذبے کا ترجمان بن جاتا ہے اور اس کی شاعری میں ہر دور کے انسان کے جذبے کا ترجمان بن جاتا ہے اور اس کی شاعری میں ہر دور کے احساس کی تعبیر کا وصف پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے معانی کی تہیں یوں کھلتی ہیں کہ ہر انسان انفرادی طور پر اور ہر عہد بہ حیثیت مجموعی ان میں اپنی محرومی، اپنے غم، اپنی آرزو اور اپنے عزم کی تصویریں دیکھتا ہے۔۔۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعرِ امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کو احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

بالکل شخصی سطح پر فرمان صاحب نے غالب کو ایک بطلِ عظیم کے پیکر میں دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انہیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انہوں نے پوری فراخدلی سے داد دی ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست بُرد سے محفوظ رہا ہے۔

(۱۹۷۱ء)

ضمیمہ دوم

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی

تحریر:

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

مطبوعہ:

(نقوش غالب، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور غالب شناسی

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے پندرہ مقالات پر مشتمل ایک مجموعہ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ستمبر ۱۹۷۰ میں لاہور سے شائع ہوا۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے لفظوں میں، کسی شاعر کو بیک وقت شاعرِ امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیان فصل و بُعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعر امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

(نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء ص ۶۰۴)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے جس تواتر اور انہماک کے ساتھ تنقید اور تحقیق کو اپنا شغل اور شعار بنایا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری کسی یونیورسٹی کے کسی اردو شعبے سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ غالب سے فرمان صاحب کو ایک گونہ شغف ہے۔ ''غالب، شاعر امروز و فردا'' ان کے اسی مدۃ العمر کے عشق کا مظہر ہے۔ پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کے بعض خالصتاً تحقیقی مضامین، غالب کی زندگی کے بارے میں نئی معلومات کے حامل ہیں، بعض ایک نئے تنقیدی زاویے سے غالب کے فکر و فن کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں اور بعض مضامین میں تحقیق و تنقید، دونوں کے خوشگوار امتزاج سے قابلِ قدر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

غالب صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، خود میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں صرف غالب صدی کے موقع پر شائع ہونے والی دو سو سے زیادہ کتابیں (یا کتابی اہمیت کی چیزیں) موجود ہیں لیکن بقا صرف ان چیزوں کے لئے ہے جو عالمِ انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی یہ کتاب ان کے کم وبیش ایک چوتھائی صدی کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطۂ نظر میں تازگی اور اسلوب میں توانائی ہے اور اس لئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اہم کتاب، غالب صدی پر شائع ہونے والی ان سینکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ کتاب پاکستان اور پاکستان سے باہر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اضافی مطالعے کے لئے تجویز کی گئی ہے اور بہت شوق سے برابر پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا پہلا معلوم مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع پر ہے۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس بیالیس برس پہلے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ، شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سرمو فرق نہیں آیا۔

کلام غالب کے استفہامیہ لب ولہجہ کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور وفکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

جناب شمس الرحمن فاروقی نے رسالہ ''غالب نامہ'' دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء) میں فرمان صاحب کا حوالہ دیئے بغیر ''اندازِ گفتگو کیا ہے؟'' کے عنوان سے غالب کے طرزِ استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ''شمس الرحمن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ایک بہت معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' (مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور

بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب تحقیق و تنقید (کراچی ۱۹۶۳ء) نیز ان کی ایک دوسری بہت اہم کتاب ''غالب: شاعرِ امروز و فردا'' (لاہور ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہے۔یہ مقالہ ''تنقیدِ غالب کے سو سال'' نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء) میں بھی منتخب ہوا۔

(غالب نامہ، تجزیاتی مطالعہ، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۴ء)

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات کے بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔

مئی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا یہ مقالہ ''نگار'' (لکھنؤ) کے صفحات پر اول اول سامنے آیا اور ہند تا سندھ لہر در لہر تحسینی مباحث کا باعث ہوا۔بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رسالہ ''نگار'' لکھنؤ کی ذہنی زندگی کے عجائبات میں سے تھا۔اونچے طبقے میں صاحبِ علم اور صاحب ذوق ہونے کی پہچان یہ تھی کہ ''نگار'' کا خریدار ہو اور اس کی رایوں پر بحث کر سکتا ہو۔''نگار'' محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک رجحان، ایک قدر تھا۔''نگار'' کا نام ندوۃ العلماء سلطان المدارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور ''نگار'' میں مضمون چھپ جانا ویسا ہی تھا جیسا کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے۔

(نگار پاکستان کراچی، نیاز نمبر، حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو اسی ''نگار'' سے مئی ۱۹۵۲ء میں ان کے مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' کی اشاعت پر ادبی تنقید کی سند ملی۔یہ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے جبکہ ''آج'' کے بہت سے ''نامور'' غالب شناسوں نے غالب پر لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔یا غالب سے متعلق ان کی کوئی قابلِ ذکر تنقیدی تحریر، اس وقت (۱۹۵۲ء کے نصف اول) تک سامنے نہیں آئی تھی۔مجھے نہیں خیال کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، کالیداس گپتا رضا، ڈاکٹر وحید قریشی، مرتضٰی حسین، فاضل لکھنوی، ڈاکٹر گیان چند، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور قدرت نقوی ایسے ممتاز غالب شناسوں کی غالب سے متعلق کوئی قابلِ لحاظ تنقیدی

تحریر ۱۹۵۲ء سے پہلے شائع ہوکر توجہ کا مرکز بنی ہو۔

''غالب: شاعرِ امروز و فردا'' میں فرمان صاحب کے پندرہ مقالے شامل ہیں جو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۹ء تک کا حاصل ہیں لیکن یہ اس عرصے کا کُل حاصل نہیں۔ غالب کے بارے میں بہت سی تحریریں اس کتاب میں شامل نہیں۔ مثلاً اس جگہ فرمان صاحب کی ان تحریروں کے چند حوالے بے محل نہ ہوں گے:

۱۔ غالب کا ایک غیر معروف قطعہ، افکارِ نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء

۲۔ غالب و انیس کا زمانہ، رباعی کا ایک اہم دور، مشمولہ: اردو رباعی ۱۹۶۲ء

۳۔ جدید اردو غزل، غالب سے حالی تک، سالنامہ نگار، کراچی ۱۹۶۵ء

۴۔ ''غالب اور دوسرے مضامین'' (تبصرہ) نگار، کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء

۵۔ ''جہانِ غالب'' (تبصرہ) نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء

۶۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی، سیپ، کراچی شمارہ ۸

۷۔ ''روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب'' (تبصرہ) نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء

۸۔ ''احوال و نقدِ غالب'' (مقدمہ/تبصرہ) نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۶۷ء

۹۔ غالب و سرسید، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء

پھر ۱۹۶۹ء کے بعد اب (۱۹۹۴ء) تک غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مختلف مواقع اور حوالوں سے اتنا کچھ مزید لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ایک مستقل مجموعے کو کفایت کرے۔ لیکن یہاں میں ان کے صرف ایک مقالے کا ذکر کروں گا۔ ''کیا دیوان غالب نسخۂ امروہہ واقعی جعلی ہے؟'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کا یہ معرکہ آرا تحقیقی مطالعہ، رسالہ ''غالب'' کراچی (شمارہ ۸، ۹، سال ۷۷۔۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے مشمولات سے جزوی یا کلی اختلاف ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بحث ہے جس کا یہ محل نہیں لیکن یہ مقالہ فرمان صاحب کی جرأتِ اظہار کی بہت اچھی مثال ضرور ہے۔ اور اس موضوع پر بلا قیدِ مقام و وقت جہاں اور جب بھی بحث ہوگی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اس مقالے سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکے گا۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے بارے میں فرمان صاحب ہنوز برابر سوچ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں اور ان کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے۔ چنانچہ پچھلے دو برسوں میں تنقید غالب کے سلسلے میں ان کے بعض بہت اہم مقالات شائع ہوئے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہم عصر سماجی مسائل کا ادراک اور غالب

(غالب نامہ (دہلی) جولائی ۱۹۹۲ء سالنامہ صریر کراچی ۱۹۹۱ء)

۲۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر

(سہ ماہی تمثال (کراچی) شمارہ ۴/۹، جلد ۱، ۱۹۹۳ء)

۳۔ غالب کی شاعری اور مسائلِ تصوف

(سالنامہ "صریر" کراچی بابت جون، جولائی ۱۹۹۳ء)

۴۔ کلامِ غالب میں لفظ "تمنا" کی تکرار

(خاص نمبر، اوراق، لاہور ۱۹۹۳ء)

کہنا یہ ہے کہ فرمان صاحب نے "غالب: شاعر امروز و فردا" کی اشاعت کے بعد پچھلے ۲۴، ۲۵ برس میں بھی غالب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا، اگرچہ وہ صرف غالب ہی کے ہو کر کبھی بھی نہیں رہے! انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے کہ:

> "غالب کی شخصیت یک پہلو نہیں، ہشت پہلو ہے، ان کا فن یک رنگ نہیں صد رنگ ہے، ان کی ادبیت یک شیوہ نہیں، ہزار شیوہ ہے، ان کی ذات یک صفت نہیں، جامع الصفات ہے، اردو میں ان کی اوّلیات ایک دو نہیں متعدد ہیں اور شعر و ادب پر ان کے احسانات دو چار نہیں، بے شمار ہیں۔

میں یہی بات خود فرمان صاحب کے بارے میں کہتا ہوں، محض کہتا ہی نہیں، اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔

(۱۹۹۴ء)

کتابیات (BIBLIOGRAPHY)

(الف) تصانیف و مُرتبات ڈاکٹر فرمان فتحپوری

۱۔ تدریسِ اردو، طبع اول، مکتبہ جامعہ تعلیم ملی، ملیرسٹی، کراچی، مارچ ۱۹۶۲ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۰ء

۲۔ اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء)، طبع اول، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۶۲ء، ۱۹۸۲ء

۳۔ تحقیق و تنقید، ماڈرن پبلشرز، صدر، کراچی، ۱۹۶۳ء، ۱۹۷۷ء، دہلی ۱۹۷۸ء

۴۔ اردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۰ء

۵۔ تاویل و تعبیر، طبع اول، نذر سنز، لاہور ۱۹۶۸ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۴ء

۶۔ مولانا جوہر، حیات اور کارنامے، لاہور ۱۹۶۹ء، ۱۹۸۸ء

۷۔ غالب، شاعر امروز و فردا، طبع اول، اظہار سنز، لاہور ۱۹۷۰ء

۸۔ قمر زمانی بیگم، دائرۃ المصنفین، لاہور ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۰ء

۹۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۲ء

۱۰۔ دریائے عشق اور بحرالمحبت کا تقابلی مطالعہ، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۲ء

۱۱۔ نواب مرزا شوق لکھنوی کی تین مثنویاں، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۲ء

۱۲۔ زبان اور اردو زبان، طبع اول، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۶ء

۱۳۔ اردو میں نعتیہ شاعری، آئینہ ادب انارکلی، لاہور ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ء

۱۴۔ نیا اور پرانا ادب، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۷۴ء

۱۵۔ ڈاکٹر محمود حسین، شخصیت اور تاثرات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۵ء

۱۶۔ ارمغانِ گوکل پرشاد، انجمن ترقیٔ اردو، کراچی ۱۹۷۵ء

۱۷۔ میر انیس حیات اور شاعری، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۷۶

۱۸۔ ہندی اردو تنازع، طبع اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۸ء

۱۹۔ اردو املاء اور رسم الخط، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۴ء

۲۰۔ مولانا حسرت موہانی، شخصیت اور کارنامے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۷۷ء

۲۱۔ اقبال سب کے لئے، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۷۸ء، دہلی ۱۹۸۰ء

۲۲۔ SIR SYED AHMED ON THE PRESENT STATE OF INDIAN POLITICS سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۸۲

۲۳۔ اردو افسانہ و افسانہ نگار، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۴ء

۲۴۔ دید و باز دید (سفرنامہ)، کاروان ادب، ملتان ۱۹۸۳ء

۲۵۔ خطبات محمود، یونیورسل بکس، اردو بازار، لاہور ۱۹۸۳ء

۲۶۔ فن تاریخ گوئی اور اس کی اہمیت، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۸۴ء

۲۷۔ نیاز فتحپوری، شخصیت اور فن، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۸۶ء

۲۸۔ PAKISTAN MOVEMENT AND HINDI-URDU CONFLICT، لاہور ۱۹۸۶

۲۹۔ اردو کا افسانوی ادب، بیکن بکس، ملتان ۱۹۸۸ء

۳۰۔ اردو کی ظریفانہ شاعری، فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۸ء

۳۱۔ اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، وکٹری بک بینک، لاہور ۱۹۹۰ء

۳۲۔ تحریکِ پاکستان اور قائداعظم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء

۳۳۔ نیاز فتحپوری، دیدہ و شنیدہ، فیروز سنز، لاہور ۱۹۹۱ء

۳۴۔ امراؤ جان ادا (مقدمہ) دائرۃ المصنفین، لاہور ۱۹۹۲ء

۳۵۔ قومی یکجہتی، اردو اور پاکستان، کراچی ۱۹۹۲ء

۳۶۔ سری پرکاش اور پاکستان، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور ۱۹۹۳ء

۳۷۔ ادبیات و شخصیات، پروگریسو بکس، لاہور ۱۹۹۳ء

۳۸۔ اردو کی بہترین مثنویاں، نذیر سنز پبلیشرز، لاہور ۱۹۹۰ء

۳۹۔ اردو املاء اور رسم الخط (اصول و مسائل)، حلقہ نیاز و نگار، کراچی، طبع سوم ۱۹۹۳ء

۴۰۔ غزل، اردو کی شعری روایت، حلقہ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۵ء

۴۱۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، حلقۂ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۵ء،
۴۲۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء، دہلی ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۶ء
۴۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء، الوقار پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء، دہلی ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۶ء
۴۴۔ ادب اور ادب کی افادیت، ۱۹۹۶ء
۴۵۔ ادا جعفری، شخصیت اور فن، ۱۹۹۸ء
۴۶۔ میر کو سمجھنے کے لئے، لاہور، الوقار پبلیکیشنز، ۱۹۹۹ء
۴۷۔ بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں (سوانح) غیر مطبوعہ
۴۸۔ شرح دیوان غالب، غیر مطبوعہ

(ب) غالبیات سے متعلق کتابیں

۱۔ آفاق، آفاق حسین، نادراتِ غالب، ادارہ نادرات، کراچی ۱۹۴۹ء
۲۔ چغتائی، عبدالرحمن، دیوانِ غالب، مرقع چغتائی، ایوان اشاعت، پیر مکی، لاہور، س۔ن
۳۔ حالی، مولانا الطاف حسین، یادگار غالب، تاج بک ڈپو، لاہور
۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، یادگار غالب، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء
۵۔ حالی، مولانا الطاف حسین، یادگار غالب، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۷ء
۶۔ حامد علی خان (مرتبہ)، دیوان غالب، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء
۷۔ حسرت موہانی، شرح دیوانِ غالب، طبع دوم ۱۹۰۶ء
۸۔ حمید احمد خاں، پروفیسر، دیوان غالب، نسخۂ حمیدیہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۳ء
۹۔ ڈائری، غالب، ۱۸۶۹ء۔ ۱۹۶۹ء، یونائیٹڈ بینک لمیٹیڈ، کراچی، ۱۹۶۹ء

۱۰۔ زیدی، نظیر حسین، غالب اور دوسرے مضامین، مسعود اکیڈیمی، کراچی ۱۹۶۳ء

۱۱۔ سیال، محمد حیات خاں، احوال ونقد غالب، نذر سنز پبلشرز، لاہور ۱۹۶۷ء

۱۲۔ شادان بلگرامی، روح المطالب فی شرح دیوان غالب، شیخ مبارک علی ناشر وتاجر کتب، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، فلسفہ کلام غالب، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء

۱۴۔ عاصمہ اعجاز، غالب نامہ (تجزیاتی مطالعہ) شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور ۱۹۹۴ء

۱۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غالب اور مطالعہ غالب، رائٹرز اکیڈیمی، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۶۔ عبدالشکور احسن اور سجاد باقر رضوی، غالب، ذاتی تاثرات کے آئینے میں، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۷۔ عبدالباری آسی لکھنوی، علامہ، مکمل شرح دیوان غالب، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور ۱۹۳۰ء

۱۸۔ عبدالرحمن، بجنوری، محاسن کلام غالب، فخری پرنٹنگ پریس، کراچی ۱۹۶۹ء

۱۹۔ عرشی، امتیاز علی، دیوان غالب، اردو، نسخہ عرشی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۵۸ء

۲۰۔ عطاء الرحمن کاکوی، پروفیسر، نذر غالب، عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ

۲۱۔ فاروقی، نثار احمد، تلاش غالب، لاہور، مئی ۱۹۶۹ء

۲۲۔ فیاض محمود، سید "GHALIB A CRITICAL INTRODUCTION" مجلس یادگار غالب، لاہور ۱۹۶۹ء

۲۳۔ فیاض محمود، سید اور اقبال حسین، تنقید غالب کے سو سال، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

۲۴۔ قدرت نقوی، سید، غالب کون ہے، دانش کدہ، حسین آگاہی، ملتان ۱۹۶۹ء

۲۵۔ قدرت نقوی، سید، (مرتبہ)، ہنگامۂ دل آشوب، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۶۹ء
۲۶۔ کوثر چاند پوری، جہان غالب، مکتبہ کائنات، لاہور ۱۹۶۶ء
۲۷۔ مالک رام، تلامذۂ غالب، مرکز تصنیف و تالیف، نکودر ۱۹۵۹ء
۲۸۔ مالک رام، ذکر غالب، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۶ء
۲۹۔ محمد اکرام شیخ، آثار غالب، کتب خانہ تاج آفس، بمبئی ۱۹۴۷ء
۳۰۔ محمد اکرام، حکیم فرزانہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۷ء
۳۱۔ مہر غلام رسول، غالب، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور، طبع چہارم ۱۹۴۶ء
۳۲۔ مہر، غلام رسول، خطوط غالب (طبع پنجم)، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۲ء
۳۳۔ مختار الدین احمد، پروفیسر (مرتبہ)، احوال غالب، انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء
۳۴۔ مختار الدین احمد، پروفیسر (مرتبہ)، نقدِ غالب، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۵ء
۳۵۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید، تحقیق غالب، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی ۱۹۸۱ء
۳۶۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید، نقوش غالب، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء
۳۷۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید، غالب کا علمی سرمایہ، یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۹ء
۳۸۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید، غالب اور انقلاب ستاون، لاہور ۱۹۸۹ء
۳۹۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید، اشاریہ غالب، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء
۴۰۔ نیاز فتحپوری، غالب، فن اور شخصیت، اردو اکادمی، سندھ، کراچی ۱۹۸۷ء
۴۱۔ نیاز فتحپوری، مشکلات غالب، حلقہ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۳ء
۴۲۔ وزیر الحسن، عابدی، سید (مرتبہ)، پنج آہنگ، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

(ج) دیگر مآخذ

۱۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۴ء

۲۔ امراؤ طارق (مرتبہ)، ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، حصہ اول، کراچی، فروری ۱۹۹۴ء

۳۔ امراؤ طارق (مرتبہ)، ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات)، حصہ دوم، کراچی، فروری ۱۹۹۴ء

۴۔ امراؤ طارق (مرتبہ)، ڈاکٹر فرمان فتحپوری (حیات و خدمات) حصہ سوم، کراچی، نومبر ۱۹۹۴ء

۵۔ خلیق انجم، ڈاکٹر (مرتبہ)، آثار الصنادید، اردو اکادمی، دلی ۱۹۹۰ء

۶۔ عبدالحق، مولوی (مرتبہ)، اقبال طبع اول، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۴۰ء

۷۔ محمد تراب خاں باز (مرتبہ)، تنقیدات عبدالحق، شمس الاسلام پریس، حیدر آباد، دکن ۱۹۳۴ء

۸۔ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، روح اقبال، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۷ء

۹۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔ شخصیت اور ادبی خدمات، طبع اول، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۹۱ء، طبع دوم، کراچی ۱۹۹۳ء

(د) جرائد و رسائل

۱۔ ''ادب لطیف''، لاہور، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۲۔ ''ادیب''، (سہ ماہی)، علی گڑھ، جنوری تا جون ۱۹۹۲ء

۳۔ ''اردو'' (سہ ماہی) کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء (بیاد غالب)، جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء

۴۔ ''العلم'' کراچی، جنوری تا جون ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)

۵۔ ''افکار'' کراچی، شمارہ ۵۰، ۱۹۷۲ء
۶۔ ''اوراق'' لاہور، جون جولائی ۱۹۹۲ء، خاص نمبر ۱۹۹۳ء
۷۔ ''تحقیق نامہ'' مجلہ شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، شمارہ ۳۔۴، ۱۹۹۵۔۱۹۹۳ء
۸۔ ''تمثال'' کراچی، جون ۱۹۹۳ء
۹۔ ''ہندوستانی ادب'' حیدر آباد، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)
۱۰۔ ''ہماری زبان'' (ہفت روزہ) علی گڑھ، مارچ ۱۹۶۷ء، دسمبر ۱۹۶۸ء
۱۱۔ ''ہمدرد'' (صحت) کراچی، جون ۱۹۶۹ء
۱۲۔ ''راوی'' گورنمنٹ کالج، لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)
۱۳۔ ''شاعر''، بمبئی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء
۱۴۔ ''صحیفہ''، لاہور، جنوری فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، اپریل مئی، جون ۱۹۶۹ء، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۶۹ء، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۹ء
۱۵۔ ''صریر'' سالنامہ، جون، جولائی ۱۹۹۳ء
۱۶۔ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، بابت ۴۹۔۱۹۴۸ء
۱۷۔ قومی زبان کراچی، دسمبر ۱۹۶۸ء، مارچ ۱۹۶۹ء، فروری ۱۹۸۱ء
۱۸۔ ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۴۹ء، فروری ۱۹۵۰ء، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء، فروری ۱۹۷۰ء
۱۹۔ محفل، لاہور، جنوری ۱۹۷۹ء
۲۰۔ نقوش، لاہور، غالب نمبر ۱، شمارہ ۱۱۱، فروری ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)، غالب نمبر ۲، شمارہ ۱۱۳، اکتوبر ۱۹۶۹ء، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۴، ۱۹۷۱ء
۲۱۔ ''نگار'' لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء، اکتوبر ۱۹۵۲ء، جولائی ۱۹۵۴ء، دسمبر ۱۹۵۵ء مئی ۱۹۵۶ء، اکتوبر ۱۹۵۷ء، جنوری ۱۹۶۱ء، نومبر ۱۹۶۱ء

۲۲۔ نگار، کراچی، جولائی اگست ۱۹۶۵ء، جنوری ۱۹۶۶ء، اکتوبر ۱۹۶۶ء، نومبر ۱۹۶۶ء، مارچ ۱۹۶۸ء، جنوری فروری ۱۹۶۹ء، (غالب نمبر)، جون ۱۹۶۹ء، اگست ۱۹۶۹ء، ستمبر ۱۹۶۹ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء، مئی جون ۱۹۷۰ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء، جولائی اگست ۱۹۷۱ء، جون جولائی ۱۹۷۵ (محمود احمد وحید نمبر)، اپریل جون ۱۹۷۶ء (حسرت نمبر)، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء، فروری ۱۹۸۷ء، نومبر دسمبر ۱۹۷۸ء (جوہر نمبر)، نومبر ۱۹۸۷ء، فروری ۱۹۸۸ء، اپریل ۱۹۸۸ء اکتوبر ۱۹۸۸ء، فروری ۱۹۸۹ء تا جنوری ۱۹۹۲ء، جولائی ۱۹۹۲ء، اکتوبر ۱۹۹۳ء نومبر ۱۹۹۳ء، جنوری ۱۹۹۴ء، اپریل ۱۹۹۴ء، مئی ۱۹۹۵ء

۲۳۔ نیادور، کراچی، شمارہ ۵۵، ۵۶۔ ۱۹۷۱ء

(ح) غیر مطبوعہ مقالہ: ایم اے (اردو)

ا۔ "ڈاکٹر فرمان فتحپوری، بطور محقق، مقالہ نگار، نورین فردوس، گورنمنٹ کالج، لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء

(و) ملاقاتیں

ا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، اپریل ۱۹۹۶ء

۲۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن، لاہور، ۹۵۔ ۱۹۹۶ء